عصمتِ انبیاء علیہم السلام

ازافادات

علامہ شمس الحق افغانی

جمع و ترتیب

شیخ فتح الرحمٰن

لیکچرر شعبہ عربی ۔ جامعہ پشاور

کتب خانہ محلہ جنگی قصہ خوانی پشاور

عصمتِ انبیا علیہم السلام

ازافادات
علامہ شمس الحق افغانی

جمع و ترتیب
شیخ فتح الرحمٰن
لیکچرر شعبہ عربی۔ جامعہ پشاور

ناشر: تاج کتب خانہ محلہ جنگی قصہ خوانی پشاور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عصمت الانبیاء علیہم السلام

انبیاء علیہم السلام کے متعلق سب فرق سنی، شیعہ، خوارج، اہل سنت والجماعۃ معتزلہ متفق ہیں کہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں۔

فرقہ حشویہ جو اس وقت ختم ہو چکا ہے، ان کا زعم ہے کہ انبیاء معصوم نہیں ہیں۔ اور یہ عقیدہ عیسائیوں کا بھی ہے۔ اس دعوی پر عیسائی یہ دلیل پکڑتے ہیں کہ معصیت فطرت انسانی میں داخل ہے اور امور فطریہ غیر منفک ہیں۔

کیونکہ آدم سے اکل شجرہ کی معصیت سرزد ہوئی اور انبیاء آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور وہ معصیت سینہ بسینہ چلی آرہی ہے۔

جواب یہ ہے کہ خود عیسائیوں کا اقرار ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام انسان ہیں سب اناجیل میں مذکور ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام ابن آدم ہیں۔ بنا بریں چاہیئے کہ عیسیٰ علیہ السلام بھی نعوذ باللہ معصوم نہ ہوں۔ حالانکہ یہ عقیدہ نصاریٰ الٰہ بھی ہیں تو بحیثیت انسان ہونے کے غیر معصوم اور بحیثیت الٰہ ہونے کے معصوم ہوں اور یہ اجتماع نقیضین ہے اور اجتماع نقیضین باطل ہے اور یہ بطلان اس سے لازم آیا کہ انبیاء علیہم السلام معصوم نہیں ہیں اور مستلزم باطل باطل ہوا

کرتا ہے۔

تحقیق عصمت

امام راغب اصفہانی نے کہا ہے کہ عصمت لغت میں امساک اور منع کو کہتے ہیں اور یہ دونو
معنی قرآن میں موجود ہیں۔ واعتصموا بحبل اللّٰہ جمیعًا۔ لاعاصم الیوم من امر اللّٰہ۔ اور معنی
اصطلاحی میں تین قول ہیں (۱) امام راغب (۲) امام اشعری (۳) حکماء۔ امام راغب کا قول یہ ہے
حفظ اللّٰہ ایاھم لصفاء جواھرھم وفضائلھم الجسمیہ والروحیۃ وتثبیت اقدامھم
بانزال السکینۃ علیھم والتوفیق لھم بتتابع الوحی الیھم (مفردات امام راغب)
امام ابوالحسن اشعری کا قول ہے۔ الّا یخلق اللّٰہ فیھم ذنبًا۔ اور حکماء کے نزدیک عصمت کا
معنی اصطلاحی یہ ہے۔ ملکۃ تمنع الفجور للعلم بمثالب المعاصی ومناقب الطاعات شرح مو

الفرق بین العصمۃ والمحفوظیۃ

متکلمین کی کتابوں میں عصمت اور محفوظیت کے درمیان فرق کا ذکر موجود نہیں۔ البتہ
شاہ ولی اللّٰہ صاحب کے ایک قلمی مکتوب جو رسالہ الرحیم شمارہ اکتوبر ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا
اس میں شاہ صاحب رحمۃ اللّٰہ علیہ نے لکھا ہے۔
العصمۃ التحفظ من الذنوب ولزوم العذر ورد الشریعۃ۔ چونکہ شرع نے پیغمبر کی پیروی
کا حکم دیا ہے اس لئے معصیت کی صورت میں محذور شرعی لازم آجاتا ہے اور اولیاء کی پیروی
کا حکم نہیں دیا گیا ہے لہذا اولیاء کی معصیت کی صورت میں محذور شرعی لازم نہیں آتا۔

اثبات عصمت

میر سید شریف جرجانی نے شرح مواقف میں لکھا ہے کہ صادر من الانسان کفر ہوگا یا غیر کفر، غیر کفر گناہ کبیرہ ہوگا یا صغیرہ دونوں چیزیں قبل النبوۃ ہوں گی یا بعد النبوۃ وعلی التقادیر الستہ صدور اً عمداً ہوگا یا سہواً۔ انبیاء کے حق میں اہل سنت والجماعۃ کا راجح قول یہ ہے۔ العصمۃ عن الکل الا انھم یصدر منھم السھو۔ امامیہ بھی یہ عقیدہ رکھتے ہیں۔ معتزلہ کا عقیدہ ہے کہ عصمت قبل النبوۃ ضروری نہیں بعد النبوۃ ضروری ہے کیونکہ عصمت لوازمات نبوۃ میں سے ہے لیکن ان کے پاس کوئی دلیل نہیں تو جواب کی بھی ضرورت نہیں لیکن قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ وضع رسالت محل مختار میں ہوتا ہے یعنی وہ فرد جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہو وہ نبی قرار پاتا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ نبوت کے منصب سے نوازتا ہے چنانچہ قرآن کا ارشاد ہے اللہ یصطفی من الملائکۃ رسلاً ومن الناس، آہ نبی کا انتخاب خود خدائے عزوجل کرتا ہے اور اس انتخاب الٰہی کے لئے ضروری ہے کہ قبل از انتخاب وہ محل معصوم ہو ورنہ نبوت کا عظیم عہدہ غیر معصوم محل کو نہیں دیا جاتا لہٰذا ثابت ہوا کہ ہر نبی قبل نبوت معصوم ہوتا ہے جیسا کہ بعد از نبوت معصوم ہوتا ہے

پرویز کہتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں ہیں (۱) حیثیت نبی (۲) حیثیت انسان تو آپ جو کام نبی کی حیثیت سے کرتے ہیں وہ واجب العمل ہے اور جو کام انسان کی حیثیت سے کرتے ہیں وہ واجب العمل نہیں ہے۔

سر سید کہتا ہے کہ آپ جو کام دین کے اعتبار سے کرتے ہیں وہ واجب العمل ہے اور جو کام دنیا کے اعتبار سے کرتے ہیں وہ واجب العمل نہیں۔

دونوں کی بات غلط اور لغو ہے کیونکہ حضور علیہ السلام کے افعال کے درمیان یہ فیصلہ کرنا اور تفریق ثابت کرنا کہ یہ کام بحیثیت نبی ہے اور یہ کام بحیثیت انسان یہ کام دنیوی ہے اور یہ کام دینی ممکن نہیں۔ نیز اس تقسیم کے لئے کوئی دلیل موجود نہیں یہ تقسیم نہ صحابہ نے کی ہے اور نہ تاریخ صحابہ میں موجود ہے لہذا آج اس تقسیم کی جسارت نفسانی ضلالت ہے۔ دنیا کا ہر ایک کام دینی کام ہے جب کہ اس کے ساتھ احکام ستہ میں سے کوئی ایک حکم لگا ہوا ہو فرض، واجب، مستحب وغیرہ۔

عصمتِ نبی پر دلائل نقلیہ

دلیل ۱ عام۔ فاما یأتینکم منی ھدًی فمن تبع ھدای، آہ اس آیت میں نبی کو ہادی کہا گیا ہے اور ہادی تب ہو سکتا ہے کہ معصوم ہو تو معلوم ہوا کہ جمیع انبیاء معصومین ہیں۔

دلیل ۲ عام۔ فبھداھم اقتدہ۔ اس آیۃ میں اللہ تعالےٰ نے حضور علیہ السلام کو انبیاء کی اقتداء کا حکم دیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ جمیع انبیاء معصوم ہیں ورنہ حضور علیہ السلام کو ان کی اقتداء کا حکم نہ دیتا۔

دلائل نقلیہ خصوصی

(۱) لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔ احزاب ۳ع " تمہارے لئے اللہ کے رسول کے قول وعمل میں پیروی کا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ پیغمبر اپنے قول وفعل میں معصوم ہے یا نہیں؟ اگر معاذ اللہ معصوم نہیں تو حکم پیروی باطل ہے حالانکہ یہ حکم، حکم الٰہی ہے اور حکم الٰہی بطلان سے پاک ہے اور اگر معصوم ہے تو مدعی ثابت ہوا اور اس سے انکار کرنا دیوانہ پن ہے۔

(۲) اطیعوا اللّٰہ واطیعوا الرَّسول، آہ

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کی اطاعت کا حکم دیا ہے اور اطاعت پیغمبر کے قول و فعل کی پیروی کا نام ہے اور اللہ تعالےٰ نے پیروی کے لئے پیغمبر علیہ السلام کے اقوال وافعال کے درمیان استثناء نہیں کیا ہے تو معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام اپنے سب اقوال وافعال میں معصوم ہیں لہذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ضروری ہے۔

(۳) من یُّطِعِ الرَّسول فقد اطاع اللّٰہ، آہ

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اطاعت رسول کو عین اپنی اطاعت قرار دیا ہے جس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے رسول کا ہر قول وعمل پسند ہے ورنہ اطاعت کا حکم نہ دیتا۔

(۴) قل ان کنتم تحِبّون اللّٰہ فاتّبعونی یحببکم اللّٰہ، آہ

اس آیت میں اللہ تعالیٰ بندوں سے اپنی محبت کو اطاعت رسول پر مرتب بتلا دیا ہے گویا محبت الٰہیہ کے لئے اطاعت رسول سبب ہے اور سبب ومسبب کے درمیان تلازم ہوتا ہے تو ایک انسان جب ہی خدا کا محبوب بن سکتا ہے کہ پہلے رسول کا مطیع ہو۔ اس سے ثابت ہوا کہ پیغمبر کا ہر قول وفعل معصوم ہوتا ہے اور اس سے انکار قرآن سے انکار کے مترادف ہے۔

عصمت انبیاء پر دلائل عقلیہ

(۱) عقل چاہتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام گناہ سے پاک ہوں اور پرکشش ہستیاں ہوں تاکہ لوگوں کو گمراہی سے بچا کر ہدایت سے ہمکنار کر دیں۔ اور صدور گناہ کی صورت میں عوام کنارہ کش ہو جاتے ہیں جو مقصد نبوت کے خلاف کام ہے۔ جب ایک عام انسان دوسرے شخص کے متعلق یہ معلوم کر لے کہ اس سے گناہ کا صدور ہو گیا ہے تو نفسیاتی طور پر اس سے نفرت کرتا ہے تو پیغمبر تو بڑی ہستی ہے اس سے گناہ کے صدور کی صورت میں جذب الخلق الی الہدایت تو کجا عوام اور پیغمبر کے درمیان نفس تعلق بھی محال ہے اور اس صورت حال میں مقصد نبوت جو ہدایت خلق ہے حاصل نہیں ہو سکتا۔ لہذا یہ ضروری ہوا کہ پیغمبر عقلاً بھی معصوم ہو جیسا کہ نقلاً معصوم ثابت ہوا۔ کسی پیغمبر علیہ السلام کی حیثیت پیغمبری جب ہی برقرار رہ سکتی ہے کہ اس کی عصمت کو دل و جان سے مان لی جائے۔

(۲) بمقتضائے عقل نبی کے قول کا مؤثر ہونا ضروری ہے اور یہ جب ممکن ہے کہ نبی کو معصوم مان لیا جائے۔ اگر نبی غیر معصوم ہو تو قول کے ذریعے ایک فعل کو گناہ بتلا دے گا لیکن غیر معصوم ہونے کی وجہ سے خود اس فعل کا ارتکاب کرے گا تو اس صورت میں نبی کے قول و فعل کے درمیان تضاد آئے گا اور یہ تضاد قول پیغمبر کو غیر مؤثر بناتا ہے جو کارخانہ نبوت کے درہم برہم کر دینے کا بڑا سبب ہے۔

(۳) نبی اگر غیر معصوم ہو تو معاذ اللہ اس سے معصیت کا صدور ہو گا اور معصیت کی دو قسمیں ہیں (۱) تعزیری۔ (۲) غیر تعزیری۔ تعزیری معصیت کے صدور کی صورت میں پیغمبر پر تعزیر جاری ہو جائے گی۔ اور غیر تعزیری معصیت کا صدور رد شہادت کا سبب ہے اور یہ دونوں قسمیں منصب نبوت کے خلاف ہیں لہذا یہ ماننا پڑے گا کہ پیغمبر جب پیغمبر ہو سکتا ہے کہ وہ قبل از نبوت

اور بعد از نبوت معصوم ہو۔

(۴) نبی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب ہو مبغوض نہ ہو اور بالغرض اگر نبی کا کردار گفتار کے خلاف ہو تو یقینی بات ہے کہ خدائی اور انسانی قانون میں یہ امر موجب مبغوضیت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اتأمرون النّاس بالبِرّ وتنسون انفسکم وانتم تتلون الکتٰب، آہ اور مبغوضیت شان پیغمبری کے خلاف ہے۔

(۵) اگر عصمت کا انکار کیا جائے تو صدور معصیت کا اقرار کرنا پڑے گا اور معصیت کے متعلق قانون الٰہی اور قانون انسانی دونوں متفق ہیں کہ یہ موجب قہر حاکم ہے اور احکم الحاکمین کا قہر تو موجب نار جہنم ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جہنمیۃ نبوت کے منافی ہے۔

(۶) اگر معاذ اللہ انبیاء سے صدور معصیت ہو تو انبیاء کے نفوس کے عدم تزکیہ کی دلیل ہے کیونکہ نفس مزکّی سے صدور معصیت نہیں ہوا کرتا حالانکہ انبیاء کے ذمے امت کے نفوس کا تزکیہ عائد ہوتا ہے جیسا کہ قرآن فرماتا ہے۔ یتلو علیھم اٰیاتہ ویزکیھم، آہ اور جب نبی خود مزکّی النفس نہ ہو تو امت کا تزکیہ کیونکر ہو سکتا ہے۔

(۷) ہر نبی امت کے لئے بمنزلہ حاکم ہے اور حاکم بھی حاکم انقیادی ہے حاکم جبری نہیں اور حاکم انقیادی وہ ہوتا ہے جس کو لوگ اپنا مقتدیٰ تصور کر کے اس کے تابع ہوں اور اور یہ جب ہو سکتا ہے کہ نبی کو امت پر تفوق حاصل ہو اور تفوق کی صورت یہ ہے کہ نبی معصوم ہو اور امت غیر معصوم۔ اگر گناہ کے صدور میں نبی اور امت برابر ہوں تو اس حالت میں تفوق معدوم ہوگا جبکہ نبی کے لئے اس کا وجود ضروری اور لازم ہے ان وجوہات کی بناء پر نبی کا معصوم ہونا اور اس پر اعتقاد رکھنا ہر مسلمان پر واجب ہے۔

اِزَالَۃُ الْاِشْکَالَاتِ عَلٰی عِصْمَۃِ الْاَنْبِیَاءِ

اشکال اول عصمت آدم علیہ السلام پر وارد ہوتا ہے اس اشکال کی بنیاد تناول شجرہ ممنوعہ کا واقعہ ہے یہ قصہ سفر تکوین باب اول تورات میں مذکور ہے اس اشکال کی کئی ایک وجوہات ہیں جو یہاں پر ذکر کی جاتی ہیں

(۱) حضرت آدم علیہ السلام کو تناول شجرہ سے نہی بلیغ کی گئی تھی چنانچہ صاف اللہ تعالیٰ نے فرمایا ولا تقربا ھذہ الشجرۃ۔ لیکن آدم علیہ السلام نے نہی الٰہی کو توڑ دیا اور جیسا کہ امر کا توڑنا گناہ ہے نہی کا توڑنا بھی گناہ ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے اس نہی شکنی کا نتیجہ ظلم بتلا دیا ہے چنانچہ فرماتا ہے فتکونا من الظالمین اور شک نہیں کہ ظلم معصیت ہے اور مفید معصیت خود معصیت ہوا کرتا ہے۔

(۳) حضرت آدم علیہ السلام خود اس ظلم کا اعتراف کرتے ہیں ارشاد ہے ربنا ظلمنا انفسنا اور اعتراف ظلم صدور معصیت کی دلیل ہے۔

(۴) اس گناہ سے آدم علیہ السلام نے توبہ کی اور توبہ تحقق گناہ کی دلیل ہے اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام نے طلب مغفرت کی اور فرمایا کہ عدم مغفرت کی صورت میں ہم خسران میں ہونگے ارشاد ہے۔ فتلقی اٰدم من ربہ کلماتٍ فتاب علیہ، آہ وان لم تغفر لنا وترحمنا لنکونن من الخٰسرین

(۵) اس فعل پر سزا مرتب ہوئی اور حضرت آدم علیہ السلام حضرت حوا علیہا السلام دار النعم سے دار المحن منتقل ہوئے۔ قلنا اھبطوا منہا جمیعًا، آہ اور سزا معصیت ہی پر مرتب ہو سکتی ہے۔

(۶) چھٹی وجہ یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اس گناہ کا احساس قیامت تک رہے گا تو کیونکر

کہا جاسکتا ہے کہ تناول شجرہ معصیت نہیں۔ اس کا بیان حدیث شفاعت میں بالتفصیل مذکور ہے۔

جوابات ازوجوہ

جواب اوّل ازجانب معتزلہ۔ معتزلہ جواب دیتے ہیں کہ تناول شجرہ قبل از نبوت کا واقعہ ہے اور یہ معصیت نہیں اور بعد از نبوت حضرت آدمؑ سے کوئی معصیت سرزد ہوئی نہیں لہٰذا حضرت آدم علیہ السلام کی عصمت پر کوئی حرف نہیں آتا۔

(۲) یہ واقعہ آغاز سلسلہ نبوت سے پہلے کا ہے شرعی قوانین موجود نہیں تھے یہ آسمانی واقعہ ہے اور قبل از تکلیف واقع ہوا ہے اوامر اور نواہی کی ابتدا بعد از ہبوط ہوئی ہے۔ لہٰذا تناول شجرہ ممنوعہ کسی امر شرعی کا خلاف نہیں جس سے عصمت پر زد پڑتی ہے کیونکہ خلاف عصمت کے معنے یہ ہیں کہ شریعت کے ہوتے ہوئے اوامر اور نواہی شریعت کے خلاف ہو جائے۔

(۳) امام فخرالدین رازی نے تفسیر کبیر میں نقل کیا ہے کہ یہ نہی نہی تنزیہی تھی نہی تحریمی نہیں تھی اور نہی تنزیہی کے خلاف کرنا خلاف اولیٰ ہے اور خلاف اولیٰ کوئی گناہ نہیں لہٰذا تناول شجرہ سے عصمت آدم علیہ السلام پر زد نہیں پڑتی۔

(۴) تناول شجرہ خطا فی الاجتہاد سے واقع ہوا ہے بایں طور کہ لا تقربا ھٰذہ الشجرۃ آہ میں حضرت آدم علیہ السلام نے اشارہ شخصی سمجھ کر اس نوع کے کسی دوسرے درخت سے تناول فرمایا حالانکہ مراد خداوندی اشارہ نوعی تھا کہ اس نوع کے ہر ایک درخت سے تناول ممنوع تھا۔ اس کی نظیر ایک حدیث ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہاتھ میں ریشم اور دوسرے ہاتھ میں سونا پکڑ کر فرمایا ھٰذان حرامان لامتی، تو یہاں اشارہ نوعی مراد ہے حالانکہ حضور علیہ السلام

کے مبارک ہاتھوں میں ریشم اور سونے کا ایک مخصوص حصہ تھا۔ اور خطائی فی الاجتہاد کی صورت میں بھی مجتہد کو ثواب ملتا ہے حدیث میں آتا ہے۔ اذا اجتھد الحاکم فاصاب فلہ اجران وان اخطأ فلہ اجر واحد۔ اور شک نہیں کہ اجر نیکی ہی پر مرتب ہوتا ہے بنا براں تناول شجرہ بجائے اس کے کہ معصیت ہو کار خیر اور موجب اجر ثابت ہوا اور موجب اجر کے ارتکاب سے عصمت کو مخدوش سمجھنا دانشمندی کے خلاف ہے۔

(۵) جواب از علامہ شمس الحق صاحب افغانی ۔ فرماتے ہیں کہ یہ نہی تشریعی نہیں تھی بلکہ نہی تشفیقی تھی۔ گناہ نہی تشریعی کا توڑنا ہے نہ کہ نہی تشفیقی کا۔

نہی تشفیقی کی مثال یہ ہے کہ ایک حکیم حاذق ایک مریض کو پرہیز بتلا کر چند مخصوص چیزوں کے استعمال سے روکتا ہے کہ ان چیزوں کے استعمال سے فلاں فلاں نقصان پیدا ہوتا ہے تو اس ممانعت سے یہ لازم نہیں کہ اشیاء ممنوعہ حرام ہیں اور اس کا استعمال جرم اور معصیت ہے۔

(۶) جواب از وجہ ثانی و ثالث۔ تناول شجرہ ممنوعہ پر اگرچہ قرآن مجید نے عصیان اور غوایت کا اطلاق کیا ہے چنانچہ فرماتا ہے فعصیٰ آدم ربّہ فغویٰ ۔آہ نیز تناول شجرہ کو حضرت آدم علیہ السلام نے ظلم قرار دیا ہے جیسا کہ اعتراض میں بیان ہو گیا ہے اور اسے نہی شکنی سمجھ کر اسے گناہ ٹھہرا دیا گیا۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ امر و نہی کا توڑنا جب گناہ ہے کہ امر و نہی کی خلاف ورزی کرتے وقت قصد و ارادہ موجود ہو اگر ارادہ موجود نہ ہو تو وہ گناہ تصور نہیں کیا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ بغیر ارادہ قوانین شرعیہ اور قوانین انسانیہ توڑنے والا شخص مجرم نہیں۔ دیکھئے کہ نہار رمضان میں قصداً افطار کرنا جرم اور موجب کفارہ ہے جو من وجہ سزائے جرم ہے لیکن اگر نسیاناً اور بلا قصد مفطرات ثلاثہ میں سے کوئی ایک واقع ہو جائے تو یہ نہ گناہ ہے اور نہ اس کی کوئی سزا ہے۔ اسی طرح انسانی قانون میں قتل عمد موجب پھانسی ہے لیکن اکسیڈنٹ کی صورت میں روزانہ سینکڑوں اموات واقع ہو جاتی

ہیں مگر یہ صورتحال قانونی گرفت سے مستثنیٰ ہے اور ڈرائیور کو پھانسی نہیں دی جاتی۔
اس تمہید کے بعد واضح ہوا کہ تناول شجرہ کے وقت حضرت آدم علیہ السلام نے نہی شکنی کا تعمد نہیں کیا تھا اور ان سے اس نہی کا ذہول واقع ہوا تھا خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا آہ۔ یہاں نسیان کا ثبوت اور قصد کی نفی متحقق ہے۔ شیطان کے وسوسہ سے رغبت اکل آگئی تھی کہ تناول شجرہ سے یا تو فرشتہ ہو جاؤ گے یا مخلد فی الجنۃ لیکن اکل شجرہ تذکر نہی کی حالت میں نہیں ہوا تھا کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام سے نعمائے جنت میں منہمک ہو کر نسیان نہی آیا تھا شجرہ ممنوعہ کا تعین یقینی نہیں عنب، زیتون، اور گندم بتلا دئے گئے ہیں، حق یہ ہے کہ بلا تعین کسی لذیذ اور جاذب پھل کا درخت تھا۔ رہا عصیان اور غوایت کا اطلاق تو یہ صورۃً کیا گیا ہے
تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ایک صورت معصیت ہے اور ایک حقیقت معصیت۔ صورت معصیت یہ ہے کہ امر و نہی بلا قصد و ارادہ توڑ دیا جائے۔ اور حقیقت معصیت یہ ہے کہ امر و نہی بالقصد والارادہ توڑ دیا جائے۔ اور پہلے ثابت ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام نے بلا ارادہ نہی شکنی تناول فرمایا اور قرآن مجید میں صورت شئی پر اطلاق شئی ہوتا ہے، فمن اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدیٰ علیکم، اعتدیٰ اول میں [illegible] عدوان حقیقتاً ہے اور فاعتدوا میں عدوان صورۃً ہے کیونکہ یہ بدلہ عدوان ہے عدوان حقیقی [illegible] فرمایا۔ وجزاء سیئۃ سیئۃ مثلہا سیئۃ اولیٰ حقیقت اور ثانیہ صورت ہے۔ [illegible] قرآن مجید میں ہے ولم تظلم منہ شیئا اور [illegible] کو گناہ کے اور شک نہیں کہ آدم وحوا [illegible] نقصان کیا اگر اکل شجرہ نہ کرتے [illegible] تو [illegible] اور شرعی معنی کے لحاظ سے بھی ظلم کا معنی گناہ نہیں امام آلوسی نے روح المعانی میں اور ابن حزم اندلسی نے الملل والنحل میں ظلم کا معنی وضع کل شیئ فی غیر محلہ لکھا ہے

معنی شرعی کے اعتبار سے فتکونا من الظالمین، کا معنی یہ ہوگا کہ اگر تم نے شجرہ ممنوعہ سے کچھ کھایا تو تم اس نہی کو بے محل استعمال کر دگے کیونکہ اس کا محل اجتناب عن الاکل ہے اور ارتکاب اکل غیر محل ہے محمل نہی عموم ہے اور اس کو شجرہ جزئی پر حمل کر کے اس کی نوع سے دوسرے شجرہ کھانا استعمال فی غیر محلہ ہے۔ اگر ظلم کا معنے اتلاف حق لیا جائے تو مظلوم خود ان کے نفوس ہیں کیونکہ اکل شجرہ سے بڑی تکلیف میں پڑ گئے قرآن مجید میں ہے فلا یخرجنکما من الجنۃ فتشقی، لے فتقع فی الکلفۃ اور اپنے آپ کو تکلیف میں ڈالنا اپنی حق تلفی ہے اور ربنا ظلمنا انفسنا میں اس معنی کی طرف اشارہ ہے۔

جواب از وجہ رابع۔ بے شک حضرت آدم علیہ السلام نے تناول شجرہ سے زاری کا اظہار کر کے توبہ فرمائی ہے لیکن ہر توبہ دلیل گناہ نہیں۔ دلیل اس بات کی یہ ہے کہ تاب یتوب کا معنی رجوع ہے اور یہ بندہ اور اللہ کی صفت ہے، توبوا الی اللہ توبۃ نصوحا، انہ ھو التواب الرحیم ۵ باعتبار بندہ توبہ کا معنی لوٹنا ہے اور اللہ کے اعتبار سے رحمۃ سے پیش آنا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے توبہ کی اور اللہ نے اپنے فضل وکرم سے اس اس توبہ کو قبول فرمایا اور یہ توبہ، توبہ عن المعصیۃ نہیں تھی بلکہ حضرت آدم علیہ السلام نے تناول شجرہ کو گناہ سمجھ کر توبہ فرمائی اور ایک صاحب المرتبۃ العلیا خلاف اولیٰ کو گناہ سمجھ کر توبہ کر لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ ان کی تسکین قلب کے لئے ان کی توبہ قبول فرمالیتا ہے۔ بسا اوقات نیک اشخاص توبہ بطور عبادت کرتے ہیں اور جتنا مرتبہ بلند ہو اتنا ہی توبہ زیادہ کر لیتے ہیں، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کہ معصوم ہیں کثرت سے توبہ فرماتے تھے۔ حدیث شریف میں آتا ہے جس کی روایت صحیحین نے کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں انی استغفر اللہ فی کل یوم سبعین مرۃ، اور سنن کی روایت میں مائۃ مرۃ، ہے عدد خاص مقصود نہیں بلکہ مراد کنایہ از کثرت ہے۔ قرآن مجید میں ہے ومن اضطر غیر باغ ولا عاد فلا اثم علیہ ان اللہ غفور رحیم ۵ آیت کی ابتدا سے ثابت ہوتا ہے کہ

حالت اضطرار میں مردار کا کھانا گناہ نہیں اور اخیر آیت میں بتلا دیا گیا ہے کہ اللہ غفور رحیم ہے یعنی اگر تم اس کھانے کو گناہ بھی سمجھو تو بھی اللہ اس گناہ کو معاف کر دے گا۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے، تبتغی مرضات ازواجک واللہ غفور رحیم ۔ یہاں حضور علیہ السلام نے ایک حلال چیز کے کھانے سے اجتناب فرمایا جو قطعاً گناہ نہیں مگر اللہ نے یہاں پر غفران اور رحمۃ کا ذکر فرمایا تو اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کا غفران صرف گناہ سے متعلق نہیں اور اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی طلب رحمت و مغفرت مستلزم معصیت آدم علیہ السلام نہیں۔

اللہ یفرح بتوبۃ عبادہٖ۔ اس کلیہ کے تحت توبہ آدمؑ موجب رضائے باری تعالیٰ ہے نہ کہ اس نے ایک معصیت سے توبہ کر دی ہے کیونکہ وہ معصوم ہیں اس جمیع بیان سے عیسائیوں کے عقیدہ کفارہ کی تردید ہوئی جس کی بنار اس پر تھی کہ فطرت انسانی میں معصیت داخل ہے اور اولاد آدم معصیت سے الگ نہیں ہو سکتی کیونکہ آدم علیہ السلام نے خود معصیت کی اور اس سے سینہ بسینہ اولاد آدم میں چلی آرہی ہے

ازالۃ الاشکال

اشکال پڑتا ہے کہ جنت سے اخراج ابلیس کے بعد القار وسوسہ شیطان کیسے ممکن ہوا؟ جب موسوس اور موس الیہ ایک مکان میں نہ ہو تو وسوسہ کیسے ڈالا جا سکتا ہے۔ اس اشکال کا جواب کئی ایک وجوہ سے دیا جا سکتا ہے۔

وجہ اوّل یہ ہے کہ شیطان پر فاخرج فانک رجیم وان علیک اللعنۃ الیٰ یوم الدین ۵ کا حکم قانونی طور پر لاگو ہوا تھا تکوینی طور پر نہیں۔ قانونی حکم سے خلاف ہو سکتا ہے تو ممکن ہے کہ شیطان چوری چھپکے جنت میں غیر قانونی طور پر داخل ہو گیا ہو۔

وجہ دوم یہ ہے کہ شیطان کو خروج کا حکم دیا گیا تھا لیکن اس کا بوریا بستر نہیں پھینکوایا گیا تھا تو اس دور میں اکل شجرہ کا وسوسہ ڈالا۔

وجہ سوم یہ ہے کہ آدم وحوا کبھی کبھار جنت کے دروازے تک آتے تھے ایک دفعہ شیطان باہر سے جنت کے دروازے تک آیا اور وسوسہ ڈالا۔ یہ وجہ امام رازی نے تفسیر کبیر میں بعض اہل اصول سے نقل کی وجہ چہارم یہ ہے کہ شیطان نے اہباط وسوسہ کے لیے شکل تبدیل کر دی تھی غیر ابلیسی شکل میں وسوسہ ڈالا وجہ پنجم یہ ہے جو راجح وجہ ہے۔ علامہ محمود آلوسی بغدادی نے روح المعانی میں اور امام رازی نے تفسیر کبیر میں حسن بصری سے نقل کیا ہے کہ شیطان کے وسوسہ ڈالنے کیلئے اتحاد مکانی ضروری نہیں۔ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے وسوسہ ڈالنے کی طاقت دی ہے اسے یہ قوت بھی دی ہے کہ وہ الگ مکان میں ہو اور وسوسہ ڈالے۔ دور حاضر میں یہ مسئلہ بالکل واضح ہو گیا کہ ایک مکان میں صاحب آواز ہوتا ہے اور دوسرے مکان میں سننے والا ہوتا ہے اور برابر شنوائی ہو سکتی ہے، ٹیلیفون وائرلیس ریڈیو اور ٹیلیویژن سے یہ کام لیا جاتا ہے جب واشنگٹن سے جاپان اور چین تک آواز پہنچ سکتی ہے تو خارج جنت سے داخل جنت تک کیوں آواز نہیں پہنچ سکتی ؟۔

جواب از وجہ خامس یہ ہے کہ بے شک اہباط آدم تناول شجرہ پر مرتب ہوا لیکن یہ سزا نہیں بلکہ یہ ترتب ترتبِ نتیجہ طبعی ہے جیسا کہ زہر کھانے سے موت۔ زغلہ کھانے سے اشباع واقع ہوتا ہے۔

جواب از وجہ سادس یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو تاقیامت احساس تنادل دلیل عظمت شان آدم علیہ السلام ہے اور ان کا قلب حساس ہے کہ باوجود اس کے کہ اس نے بلا قصد نہی شکنی کی ایک ایسا کام کیا جس کو اللہ تعالیٰ نے سبب مواخذہ بھی نہیں ٹھہرایا ان کا حساس قلب اس سے غافل نہیں اور برابر اور روئیے حدیث دنیا سے لیکر تاقیام قیامت وہ کام محسوس رہا اور ایسے ہی ایک پیغمبر کی شان ہونی چاہیئے۔

عصمت آدم علیہ السلام پر اشکال دوم :۔ قرآن مجید میں آدم وحوا علیہما السلام کی طرف شرک

کا انتساب کیا گیا ہے ارشاد ہے، ھوالذی خلقکم من نفس واحدۃ وجعل منھا زوجھا لیسکن الیھا فلما تغشٰھا حملت حملاً خفیفاً فمرّت بہ فلما اثقلت دعوا اللہ ربھما لئن اٰتیتنا صالحاً لنکونن من الشاکرین ○ فلما اٰتٰھما صالحاً جعلا لہ شرکاء فیما اٰتٰھما فتعلی اللہ عما یشرکون ○ (اعراف-ع)

اس آیتہ کے ساتھ اگر ترمذی کی یہ روایت ملائی جائے کہ شیطان نے ان سے کہا کہ اپنے بیٹے کا نام عبدالحارث رکھو تو وہ زندہ رہے گا تو اشکال زیادہ قوی ہو جاتا ہے۔

الجواب :۔ اس حدیث سے جواب یہ ہے کہ محققین علم حدیث نے کہا ہے کہ ترمذی کی ۲۲ حدیثیں موضوع ہیں جن میں سے ایک یہ ہے۔

حافظ عمادالدین ابن کثیر کہتے ہیں کہ یہ روایت اور اس کے ہم معنیٰ دیگر روایات سب موضوعی ہیں، حافظ ابن حزم اندلسی الملل والنحل میں لکھتے ہیں ھذہ الروایۃ موضوعۃ مکذوبۃ وضعھا من لادین لہ، ولاحیاء، آیت مذکورہ سے دو طرح سے جواب ہے

(۱) ہم نہیں مانتے کہ آیت مذکورہ کا تعلق آدم وحوا علیہما السلام سے ہے بلکہ اس کا تعلق فہر سے ہے جو اپنے مورث اعلیٰ نضر کے خطاب قریش سے مشہور ہوا اور اسی ہی سے خاندان قریش پھیلا اور یہ راجح جواب ہے تو مطلب یہ نکلا کہ اے قریش ہم نے تم کو ایک نفس سے پیدا کیا جو قریش مرد تھا اور اس کی قریشیہ بیوی تھی جب دونوں کی صحبت ہوئی اور یکے بعد دیگرے چار بیٹے پیدا ہوئے تو انہوں نے بجائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ سے منسوب کرتے غیروں کی طرف منسوب کئے چنانچہ ان کے نام یہ ہیں (۱) عبدمناف (۲)، عبدالعزیٰ (۳) عبدشمس (۴)، عبدالدار، حالانکہ انہوں نے کہا تھا لئن اٰتیتنا صالحاً لنکونن من الشٰکرین ○ ان چاروں کو اللہ کے شرکاء ٹھرایا اور اللہ تعالیٰ شرک سے پاک ہے فتعلی اللہ عما یشرکون۔ میر سید سند نے شرح مواقف میں لکھا ہے کہ اس آیت کا تعلق آدم وحوا

علیہما السلام سے نہیں وعلیہ اکثر المفسرین، وجعلا لہ شرکاء، میں صیغہ جمع ہے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس آیت کا تعلق آدم وحوا سے نہیں ورنہ شریکاً، کہنا چاہیئے تھا کیونکہ بقول معترض عبد الحارث تو ایک شخص تھا، یہ بیانِ جواب کی ایک قسم ہے کہ اس آیت کا تعلق آدم وحوا سے نہیں

(۲) جواب کی دوسری طرح یہ ہے کہ بے شک آیت میں آدم علیہ السلام کا تذکرہ ہے مگر کل آیت آدم وحوا سے متعلق نہیں ہے صرف یہ حصہ آدم وحوا سے متعلق ہے، ھو الذی خلقکم من نفس واحدۃ وجعل منھا زوجھا لیسکن الیھا اور فلما تغشٰھا .... وجعلا لہ شرکاء، ہر عام زوج زوجہ سے متعلق ہے جو مشرک ہوں۔ اللہ یہ فرمانا چاہتا ہے کہ اس نے تم کو ایک نفس سے پیدا کیا اور تم آگے چل کر اس کے ساتھ شرک فی التسمیہ کرنے لگے۔

قرآن میں یہ قاعدہ ہے کہ خاص سے عام کی طرف انتقال ہوتا ہے۔ اس کی نظیر یہ ہے ولقد زینا السماء الدنیا بمصابیح وجعلناھا رجوماً للشیٰطین۔ تو مصابیح سے مراد ستارے ہیں جو اجرام نیرہ کی ایک قسم خاص ہے اور رجوماً سے مراد عام اجرام نیرہ ہیں جن میں شہب بھی داخل ہیں (روح المعانی از حسن بصری) تو اول کلام میں خاص اور آخر کلام میں عام لایا گیا ہے۔

(۳) ہم مانتے ہیں کہ جعلا لہ شرکاء بھی آدم وحوا سے متعلق ہے لیکن بطور استفہام انکاری۔ یعنی یہ قصہ تو اسرائیلات میں مذکور ہے مگر قرآن اس کا اقرار اور اثبات نہیں کرتا۔ (روح المعانی)

(۴) جعلا لہ شرکاء میں نسبت از قبیل مجاز عقلی ہے بایں طور کہ شرک تو اولادِ آدم کرتی ہے لیکن نسبت باپ کی طرف ہو گئی ہے کیونکہ وہ سبب اولاد ہے اور اس قسم نسبت کو فن معانی میں مجاز عقلی کہتے ہیں

(۵) بشرط تسلیم قصہ نسبت شرک سے یہ توجیہ کی جا سکتی ہے کہ عبد الحارث میں حارث حرث سے ماخوذ ہے اور حرث کسب وکار کو کہتے ہیں من یرید حرث الدنیا ومن یرید حرث الآخرۃ

ہر کوئی کاسب و کارندہ ہے حتیٰ کہ آدم علیہ السلام بھی کاسب تھے بلکہ ہر کسب کا منبع تھے اور عبد سے مراد بیٹا ہے جو اس کا غلام اور خادم تھا یہی وجہ ہے کہ عرب میزبان کو عبدالضیف کہتے ہیں تو اس کے باوجود کہ عبدالحارث کا معنے اس توجیہ کی رو سے درست اور صحیح ہے لیکن چونکہ عبد میں ابہام بسوئے معنے بندہ ہوتا ہے اس لئے آدم وحوا پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈانٹ پڑ گئی کیونکہ بمقتضائے حسنات الابرار سیئات المقربین خواص سے بعض ان چیزوں پہ مواخذہ ہوتا ہے جو عوام سے نہیں ہوتا اور یہ عصمت کے منافی نہیں بلکہ دلیل عصمت ہے کہ سفید کپڑے کو معمولی سے داغ سے بھی محفوظ رکھنا چاہیئے۔ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰیٓ اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰھِیْمَ ۝

عصمتِ ملائکہ پر اشکال

عظمت دین کیلئے جیسے کہ عصمت انبیاء علیہم السلام ضروری ہے ویسے ہی عصمت ملائکہ علیہم السلام بھی ضروری ہے اور یہ عصمت متحقق اور واقع ہے گو بعض اسلام دشمن لوگ عصمت انبیاء کی طرح عصمت ملائکہ پر بھی رکیک حملے کرتے ہیں۔ چونکہ دین کا ابلاغ بذریعہ رسل و ملائکہ ہو گیا ہے اور ملائکہ کی عصمت پر حرف آنا گویا دین کی عظمت کو ٹھیس پہنچنا ہے اس لئے ہم ان سے ہر قسم کا دفاع کریں گے اور ان سب اعتراضوں کے جوابات دیں گے جو معترضین کی خام ذہنیت کی پیداوار ہیں۔ ان اعتراضات کا منبع مندرجہ ذیل آیات ہیں۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۔

اعتراض اول۔ اللہ تعالیٰ نے بنا بر حکمت استخلاف کے لئے آدم علیہ السلام کا انتخاب فرمایا اور ملائکہ

نے اعتراض کر کے اس استخلاف سے منہ موڑا۔

اعتراض دوم۔ ملائکہ نے آدم اور اولاد آدم کی غیبت کی جو شرعاً ممنوع اور منافی عصمت ہے کیونکہ یہ گناہ کبیرہ ہے اور گنہگار معصوم نہیں ہوتا۔

اعتراض سوم۔ ملائکہ نے اپنے آپ کو بڑا سمجھ کر خدا کے سامنے تکبر کا اظہار کیا حالانکہ از روئے حدیث قدسی الکبریاء ردائی تکبر اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے۔

اعتراض چہارم۔ اسی تکبر کی وجہ سے ملائکہ نے آدمؑ سے حسد کیا حالانکہ حسد کے متعلق وارد ہے۔ ان الحسد یأکل الحسنات کما تأکل النار الحطب۔

جواب از اعتراض اول۔ ملائکہ کا یہ قول اتجعل فیھا من یفسد فیھا "آہ۔ بطور اعتراض علی اللہ نہیں بلکہ بطور استفسار عن حکمت الانتخاب اجہ ترجیح الاستخلاف ہے اگر شاگرد کا استفسار استاد سے گناہ نہیں تو یہ بھی نہیں۔

جواب از اعتراض دوم۔ غیبت کا مفہوم انتساب امر مکروہ الی شخص معین ہے لہذا امت کا اتفاق ہے کہ تحقق غیبت کیلئے تعین شخصی ضروری ہے اور ظاہر ہے کہ اس وقت نہ آدم تھا اور نہ اولاد آدم اور معدوم کی غیبت ہوتی نہیں۔

ازالۃ الاشکال۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا تسبوا الاموات، اس حدیث میں مردوں کو برا بھلا کہنے سے منع فرمایا اور مردگان معدوم ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غیبت ہے۔

جواب یہ ہے کہ یہ قیاس قیاس مع الفارق ہے اموات میں عدم لاحق اور آدمؑ میں عدم سابق ہے وبینھما بون بعید۔

جواب از اعتراض سوم۔ سوال و استفسار سے مراد اگر علو نفس ہو تو یہ تکبر ہے اور حرام و گناہ کبیرہ ہے مگر ملائکہ کی مراد علو نفس نہیں تھا بلکہ اظہار کمال برائے خدمت خلق تھا اور یہ نہ تکبر ہے اور

نہ حرام جیساکہ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا تھا اور قرآن مجید میں ان سے حکایت ہے

قال اجعلنی علیٰ خزائن الارض انی حفیظ علیم ۝

جواب از اعتراض چہارم ۔ جب ملائکہ نے تکبر کیا ہی نہیں تو حسد بھی نہیں کیا کیونکہ حسد کی تعریف تمنی زوال النعمۃ عن المنعم وتحصیلہ لنفسہ، ہے اور ظاہر ہے کہ تمنی جب ہو سکتی ہے کہ وہ نعمت موجود و متحقق ہو کیونکہ زوال شئی مسبوق بوجودہ ہوتا ہے اور عند المشورہ وہ نعمت موجود نہیں تھی ملائکہ نے ان اللّٰہ یأمر ان تؤدوا الامانات الیٰ اھلھا کے پیش نظر اہلیت استخلاف اپنے آپ میں دیکھ لی تھی اور علتِ انتخاب آدمؑ ان پر مخفی تھی اس وجہ سے انہوں نے کہا سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم ۝ بیان مذکور سے ثابت ہوا کہ ملائکہ کا استفسار منافی عصمت ملائکہ نہیں لہٰذا ملائکہ کی عصمت سے انکار کرنا زندقہ اور بے دینی کی نشانی ہے۔ ملائکہ نے اپنے زعم میں جو چیزیں منافی خلافت انسانی قرار دیدی تھیں جو سفک دماء اور فساد فی الارض ہے اور ان چیزوں کو ملحوظ رکھ کر استفسار کیا تھا جسے مستحق مواخذہ نہیں سمجھا جاتا گو معترضین اعتراض کرکے اپنے باطنی خبث کا ثبوت دیتے ہیں بعینہٖ ان ہی چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے سبب استحقاقِ خلافت انسان گردانا اور فرمایا انی اعلم ما لا تعلمون ۔ سفک دماء قوت غضبیہ کی طرف اور فساد فی الارض قوت شہویہ کی طرف اشارہ ہے یہ قوتیں موجب ترجیح خلافت انسان ہیں کیونکہ ملائکہ میں یہ قوتیں موجود نہیں اللہ تعالیٰ اپنی صفات ذاتیہ میں سے صفت عدل کیلئے زمین پر اپنا خلیفہ بنانا چاہا اور خلافت کی تعریف اقامۃ العدل فی الارض نیابۃً عن اللّٰہ ہے اور اور اس خلافت کی اہلیت آدم علیہ السلام میں پیدا کی گئی تھی جو قوت عقلیہ اور قوت بہیمیہ ہے اور انسان کے علاوہ کسی دوسری مخلوق میں یہ مجموعہ نہیں پایا جاتا تھا کیونکہ انسان کے علاوہ تین قسم کی مخلوق ہے (۱) عاقل خیر (۲) عاقل شر (۳) غیر عاقل ۔ عاقل خیر ملائکہ، عاقل شر

جن، اور غیر عاقل پوری کائنات ہے۔
غیر عاقل، اختیار اور عقل کے فقدان سے مظہر عدل نہیں، ملائکہ میں چونکہ بہیمیۃ نہیں اس لئے جلب منفعت اور دفع مضرت کے لیئے اقامت عدل نہیں کر سکتے۔ اور جنات تو ہیں شر اور غالب الشر ہستیاں مظہر عدل ہو نہیں سکتیں۔ تو منصب خلافت الٰہیہ کے لئے سوائے انسان کے کوئی دوسری مخلوق ہے ہی نہیں انسان ہی ایسی مخلوق ہے جو اپنی فطری صلاحیت کی وجہ سے اہل خلافت ہے قوت عقلیہ کی وجہ سے عدل کی اقامت اور قوت بہیمیہ کی وجہ سے اقامت عدل کے لئے ظلم و فساد کا حامل ہے۔ اسیطرح انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو اپنی فطری صلاحیتوں کی وجہ سے تعلیم الاسماء کا اہل تھی اور ملائکہ علیہم السلام میں یہ اہلیت مفقود تھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وعلّم اٰدم الاسماء کلھا ثم عرضھم علی الملائکۃ فقال انبئونی باسماء ھؤلاء ان کنتم صٰدقین ہ قالوا سبحانک لا علم لنا الا ما علّمتنا انک انت العلیم الحکیم ہ قال یاٰدم انبئھم باسمائھم فلما انبأھم باسمائھم قال الم اقل لکم انی اعلم غیب السمٰوٰت والارض واعلم ما تبدون وما کنتم تکتمون ہ
جلال الدین سیوطیؒ اور دیگر مفسرین نے فرمایا ہے کہ تعلیم الاسماء سے مراد چیزوں کے نام ہیں بالفاظ دیگر تعلیم لغت عربی ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی بولی عربی تھی اور مندرجہ ذیل دو شعر اس مرثیہ کے ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام نے ہابیل کے مقتول ہونے کے موقع پر فرمائے۔

تغیرت البلاد ومن علیھا ؛ ووجہ الارض مغبر قبیح
فوا اسفا علی ھابیل ابنی ؛ قتیل قد تضمنہ الضریح

پوری تفصیل تاریخ کامل لابن اثیر میں مذکور ہے۔

لیکن محققین کی رائے ہے کہ زبان عربی یعرب بن قحطان سے شروع ہوگئی ہے اور حضرت آدم علیہ السلام کی بولی سریانی تھی۔ عبرانی زبان جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بولی تھی سریانی کی ترقی یافتہ شکل ہے اور عربی عبرانی کی ترقی یافتہ شکل ہے اور عربی ام الالسنہ ہے۔ دیگر زبانوں کے علاوہ انگریزی نے بھی ہزاروں الفاظ عربی سے لئے ہیں یہ مرثیہ جو حضرت آدم علیہ السلام کی طرف منسوب ہے اس کا اسلوب بالکل جدید عربی کا ہے لہذا یہ انتساب غلط ہے۔

تعلیم الاسماء سے مراد نہ صرف اسماء الاشیاء ہیں بلکہ خواص الاشیاء بھی ہیں۔ غرضیکہ انسانی معاشرے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت تھی آدمؑ کو ان سب کی پہچان سے نوازا گیا تھا اور ملائکہ علیہم السلام کی سرشت اس پہچان کی استعداد نہیں تھی۔ یہاں پر ایک نکتۂ غامضہ ہے کہ ملائکہ سے متعلق علم کا اطلاق ہوا ہے اور آدم علیہ السلام انباء کیونکہ علم میں بغیر بتلائے کے مراد معلوم نہیں ہوتا بخلاف انباء کے کہ اس میں اشارہ سے بھی مراد معلوم ہو جاتی ہے۔ تو آدمؑ کی سرشت میں استعداد علم الاشیاء جو خلافت الٰہیہ کے لئے ضروری تھی ملی ہوئی تھی اور ملائکہ کی سرشت اس استعداد سے خالی تھی اور اگر ملائکہ کی سرشت میں بھی وہ استعداد رکھدی ہوتی تو ملائکہ، ملائکہ نہیں رہ سکتے تھے بلکہ انسان ہو جاتے۔

اس کی نظیر یہ ہے کہ قوت سامعہ حیوان لایعقل اور انسان دونوں میں ہے لیکن فہم و ادراک کی استعداد سرشت انسان میں رکھی گئی ہے حیوان لایعقل کی سرشت میں نہیں ایک سر بفلک عمارت کی خوبصورتی تو بینا سمجھ سکتا ہے لیکن نابینا نہیں سمجھ سکتا۔ غیر بالغ کے سامنے جماع کی لذت بیان کرنا لغو ہے کیونکہ وہ التقائے ختانین سے لذت حاصل نہیں کر سکتا بخلاف بالغ جوان کے کہ وہ جماع تو جماع ہے بیان جماع کے سننے سے بھی لذت حاصل کرتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ نابالغ میں استعداد نہیں ہے اور بالغ میں موجود ہے اگر نابالغ میں یہ

استعداد ہی نہ جائے تو وہ نابالغ نہ ہوگا بلکہ بالغ ہوگا
لہٰذا یہ کہنا غلط ہوگا اگر ملائکہ کو استعداد علم اور تعلیم الاسمار دی جاتی تو وہ بھی اسمار اشیار اور خواص اشیار جان لیتے اور خلافت الٰہیہ کے اہل ہوجاتے کیونکہ اس صورت میں ملائکہ ملائکہ نہیں رہ سکتے تھے بلکہ انسان ہوجاتے اور ملائکہ کا مقام خالی رہ کر از سر نو تخلیق ملائکہ کی ضرورت پڑجاتی تھی اور یہ بہ نسبت انسان کے تضییع وقت ہے۔ ایک تبدیل سرشت بطرف انسان اور دوسری تخلیق ملائکہ۔ بخلاف تخلیق انسان کے کہ اس صورت میں فعل واحد ہے خو تخلیق آدم علیہ السلام ہے تو خالق کائنات تو ہر ایسے کام کرنے سے منزہ ہے جس میں تضییع وقت کا توہم ہو۔ چونکہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کی غرض وغایت زمین پر خلافت الٰہیہ اور اقامت عدل تھی اس وجہ سے اس کو جنت میں ہمیشہ کے لئے رہنا خلاف حکمت تھا۔ جنت میں ان کی چند روزہ بود وباش اور نعم جنت سے محفوظ ہونا ایسا تھا جیسا کہ شیر خوار بچہ اغوش مادر میں رہتا ہو۔ تناول شجرہ بمنزلہ اس لال مرچ کے ہے جو مرضعہ بچے کو دودھ چھوڑانے کے لئے سر پستان پر ملتی ہو۔ دودھ کا چھڑانا شیر خوار کی پختگی اور اس کی زندگی کے ایک دوسرے دور کی آغاز کی علامت ہے اس بات کی تفریح شاہ عبد العزیزؒ نے ایک تحریر میں فرمائی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کا اہباط آدمؑ اور بنی آدم کے لئے جنت کی ابدی زندگی کی پیش خیمہ ہے اس لئے کہ اہباط کے بعد زمینی حیات میں امتثال احکام کی صورت عبادت کریں جو بذریعہ ارسال رسل وکتب متصور ہے اور عبادت کا ثمرہ جنت میں ابدی حیات ہے۔

اسیطرح آدم کا کمال علمی وعملی طاعت اور قوت علمی پر موقوف ہے اور یہ سب چیزیں زمین سے تعلق رکھتی ہیں کیونکہ جنت تو دار النعم اور دار الجزار ہے دار التکلیف نہیں۔ ؎

بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنت نخواہی یافت ،، کنار آب رکنا باد وگلگشت مصلےٰ را ،، حافظ

اس بنا پر یہ کہنا درست اور صحیح ہے کہ اہباط آدمؑ آدمؑ کے لئے جزو نفع تھا شر و ضرر نہیں تھا اس لئے اہباط آدمؑ سزائے تناول شجرہ سمجھنا ناعاقبت اندیشی و کندہ ناتراشی کی نشانی ہے۔ مگر ملا آں باشد کہ چپ نشود۔

ازالۃ الاشکال علےٰ عصمۃ نوحؑ

قرآن مجید میں ہے قلنا احمل فیھا من کل زوجین اثنین واھلک "آہ جب طوفان اٹھا اور اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی میں اپنے اہل کے سوار کر دینے کا حکم دیدیا تو نوح علیہ السلام نے دو کام ایسے کئے جو خلاف عصمت پیغمبر ہے۔

(۱) اپنے کافر بیٹے کو کشتی میں سوار ہونے کا حکم دیدیا۔

(۲) اس کافر بیٹے کی نجات کے لئے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی۔

اس اشکال کے ازالہ کے لئے مفسرین کرام نے تین[۳] جوابات دیئے ہیں

(۱) ابن منیر نے حاشیہ کشاف میں لکھا ہے کہ نوح علیہ السلام کا کنعان نامی بیٹا منافق تھا۔ نوح علیہ السلام کا علم صرف ظاہر تک تھا باطن تو اللہ ہی جانتا ہے اور ظاہر میں وہ مومن معلوم ہوتا تھا جیسا کہ ہر زمانے کا منافق ہوتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اسے مومن سمجھکر بمطابق حکم خداوندی دیگر اہل کے ساتھ کنعان کو بھی کشتی میں سوار ہونے کے لئے فرمایا اور غرق ہونے کے وقت اس کی نجات کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ اس صورت حال میں نوح علیہ السلام نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جو ان کی شایان شان نہ ہو۔ یہ جواب دیگر جوابات سے زیادہ وزنی اور راجح جواب ہے

(۲) حضرت نوح علیہ السلام کا یہ کہنا "یا بنی ارکب معنا" آہ اور "رب ان ابنی من اھلی" آہ خطائے اجتہادی تھی یعنی طوفان کے وقت جب اللہ تعالیٰ نے "احمل فیھا من کل زوجین اثنین واھلک" آہ فرمایا تو نوح علیہ السلام نے اہل کو اہل نسبی پر محمول کر کے وہ کہا جو کہا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے علم میں اہل ناجیہ میں ایمان شرط تھی اور اس شرط کی تصریح اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوئی تھی تاکہ اس کے پیش نظر حضرت نوح علیہ السلام اپنے بیٹے کو اپنا اہل نہ سمجھتے۔ لہٰذا حضرت نوح علیہ السلام کی عصمت پر حرف نہیں آتی۔

(۳) حضرت نوح علیہ السلام کا اپنے بیٹے سے سوار ہونے کے لئے کہنا اور اس کی نجات کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا زیادہ سے زیادہ خلاف اولیٰ ہے۔ چونکہ ان دونوں معاملوں کے متعلق پہلے نہی وارد نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے یہ دونوں کام قابل مواخذہ نہیں۔ رہا یہ کہ اللہ نے فرمایا "فلا تسئلن ما لیس لک بہ علم" آہ تو یہ فرمان مستقبل سے وابستہ ہے اور مستقبل میں حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے فرمان کے خلاف کوئی کام کیا ہی نہیں ورنہ معترض اعتراض پیش کرنے کا مجاز ہے لہٰذا حضرت نوح علیہ السلام کی عصمت جوں کا توں ہے اس قسم لغو لب کشائیوں سے اس پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا۔

یہاں پر ایک سوال ہے کہ طوفان نوحؑ عام تھا یا خاص؟

بعض علماء کہتے ہیں کہ عام تھا اور بعض دیگر کہتے ہیں خاص تھا۔ تطبیق یہ ہے کہ خاص اس لحاظ سے تھا کہ تمام روئے زمین پر نہیں تھا اور عام اس اعتبار سے تھا کہ جہاں جہاں انسانی آبادی پھیلی ہوئی تھی وہاں تک طوفان پہنچ گیا تھا اور اس وقت انسانی آبادی فرات اور دجلہ کے درمیان میں واقع تھی کشتی میں ۷۲ آدمی اجنبی تھے نوح علیہ السلام بمعہ اہلیہ اور تین بیٹے بمعہ ان کی زوجات کے سوار ہو گئے تھے۔ کشتی سہ منزلہ تھی اوّل منزل میں آدمی دوسرے میں حیوانات اور تیسرے میں پرندے تھے کوہ جودی جسے جدید زبان میں ارارات کہتے ہیں اور مقبوضہ ترکیہ ایشیائے کوچک میں واقع ہے

اس پر اس کشتی کو پایا گیا ہے۔

اِزالۃ الاشکالات علیٰ عِصمۃ اِبراہیم علیہ السلام

الاشکال الاول۔ قال اللہ تبارک وتعالیٰ حکایۃً عنہ۔ فلما رأی القمر بازغًا قال ھٰذا ربی فلما افل قال لا احب الافلین ۝ فلما رأی الشمس بازغۃً قال ھٰذا ربی ھٰذا اکبر۔

اشکال کا خلاصہ یہ ہے کہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کلام کا آخیری حصہ اگرچہ محل اعتراض نہیں کیونکہ اس میں انہوں نے تغیر پذیر چیزوں سے برأۃ کا اظہار کیا ہے لیکن ابتدائے کلام محل اعتراض ضرور ہے کہ اس میں غیر اللہ کو رب کہا گیا ہے اور یہ شرک ہے۔

جوابِ اول۔ شارح مواقف نے اس اشکال کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ یہ شرک قبل از نبوت ہے جو منافی عصمت انبیاء نہیں۔ لیکن یہ جواب غلط ہے کیونکہ انبیاء شرک سے مطلقاً معصوم ہیں خواہ شرک قبل از نبوت ہو یا بعد از نبوت جیسا کہ پہلے گذر گیا ہے

جوابِ دوم۔ اور یہ جواب صحیح ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو کچھ فرمایا ہے یہ فرقہ صابئین سے جو کواکب پرست فرقہ تھا بطور مناظرہ فرمایا ہے۔ محمد ابن کریم شہرستانی نے اس فرقے کے عقائد بیان کر دیئے ہیں ان عقائد کے پیش نظر ابراہیم علیہ السلام کا فرمانا گویا کہ ان پر رد کرنا ہے کہ یہ تمہارا عقیدہ ہے کہ یہ چیزیں میرا رب ہیں اور اس سے خلف لازم آتا ہے۔

لہٰذا یہ ابراہیم علیہ السلام کا عقیدہ نہیں کہ اعتراض لازم آجائے بلکہ نقل عقیدہ مخالفین ہے تاکہ بوجہ اُفول ان پر الزام عائد کر دیں۔ چونکہ اُفول غروب کو کہتے ہیں خواہ زمین کی حرکت یا شمس وقمر

کی حرکت سے ہو بہرحال تغیر ہے تو ابراہیم علیہ السلام نے بدلیل افول ان کے عقائد پر رد کردیا کہ افول تغیر ہے اور رب تغیر سے پاک ہے۔ لہذا شمس وقمر رب نہیں ہوسکتے۔

خلاصہ خلف ہوا، ھٰذا ربی علیٰ زعمکم وقد تفول ھٰذہ الاشیاء وکل مایفول فہو لا یکون ربًا فالکواکب لا تکون اربابًا۔

الاشکال الثانی۔ حدیث میں وارد ہے۔ لم یکذب ابراھیم الا ثلاث کذباتٍ قال بل فعلہ کبیرھم وقال انی سقیم وقال ھٰذہ اختی، یعنی بتوں کو خود توڑ دیا اور نسبت بڑی بت کی طرف کی۔ اپنے آپ کو بیمار بتلایا حالانکہ بیمار نہیں تھے۔ سارا کو فرعون مصر کے سامنے بہن ظاہر کردی حالانکہ یہ ان کی بیوی تھیں۔

الجواب۔ شک نہیں کہ یہ تینوں واقعات درست ہیں لیکن ان سے عصمت ابراہیم علیہ السلام مجروح نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ اس کلام میں صنعت توریہ سے کام لیا گیا ہے اور اس صنعت کا معنیٰ یہ ہے کہ ایک لفظ کے دو معنے ہوں (۱) معنی خفی (۲) معنی جلی۔ کلام کے وقت متکلم معنیٰ خفی کو مراد لیتا ہے اور مخاطب معنےٰ جلی کو لے لیتا ہے۔ تو کبیرھم میں ھم سے ابراہیمؑ کا مراد لوگ ہیں اور یہ کنایہ ہے جیسا کہ نحات نے ضمائر کو کنایات شمار کیا ہے اور مخاطب نے معنےٰ قریب مراد لیا ہے جو بت ہیں۔ اور شک نہیں کہ اس وقت سب سے بڑی شخصیت خود حضرت ابراھیم علیہ السلام کی شخصیت تھی، نیز قرینہ موجود ہے کہ کبیرھم سے مراد بڑی بت نہیں کیونکہ ھم ذوی العقول کے لئے استعمال ہوتا ہے اور بتوں کے لئے ھنّ یا مستعمل ہوتا ہے جیسا کہ قرآن نے بیان فرمایا ہے۔ ربّ انّھنّ اضللن کثیرًا من النّاس ہ

دوسرا جواب یہ ہے کہ فعلہ پر وقف ہے اور اس کا فاعل مقدر ہے۔ یعنی

فعلہ من فعلہ۔ کبیرھم ھٰذا۔ کلام مستقل ہے۔
تیسرا جواب یہ ہے کہ اگر وقف نہ بھی کیا جائے تو بھی معنی بنتا ہے بایں طور کہ فعلہ کا فاعل کبیرھم ہے اور اس سے مراد بت ہے، یعنی بتوں نے کیا ہوگا اگر ان میں نطق کی استعداد ہو مگر استعداد تو نہیں رکھتے تو فعل بھی انہوں نے نہیں کیا ہے۔
"قال انی سقیم" سے جواب یہ ہے کہ سقم سے مراد سقم قلب ہے کیونکہ شک نہیں کہ اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قلب مبارک کو صدمہ پہنچا ہوا تھا وجہ یہ ہے کہ اس دن ان کی قوم شرک کا مظاہرہ کرنے والی تھی اور موحد اعظم حضرت ابراہیم علیہ السلام ایسے منظر کا مشاہدہ نہیں کر سکتے تھے اور نہ اس پر راضی تھے اور ایک ناچاہا کام کے ہونے سے انسان کے دل کو صدمہ پہنچتا ہے خصوصاً ایک پیغمبر کا حساس دل اور لطیف ترین مزاج تو لمحہ بھر بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ کئی ایک جوابات اور بھی ہیں کہ کوئی بھی مرض سے خالی نہیں۔ یا یہ کہ وزن فعیل مستقبل کے لئے آتا ہے تو معنی یوں ہوگا، انی ساسقم، یا یہ کہ پیغمبر تو اپنے آپ کو مریض بتلاتے ہیں تو جن کو مرض کا نہ ہونا مقصود ہو وہ عدم مرض پر دلیل قائم کریں۔
حدیث مذکورہ کے متعلق امام فخر الدین رازیؒ نے تفسیر کبیر میں تفصیل کرتے ہوئے جواب دیا ہے کہ یہ حدیث ساقط الاعتبار ہے اور صحت کے درجے سے گری ہوئی ہے۔ امام رازیؒ کی اس بات سے حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں ناراضگی کا اظہار کیا ہے کیونکہ یہ حدیث صحیح بخاری میں موجود ہے۔ امام رازیؒ نے عدم صحت کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ ہم نے دو باتوں میں سے کوئی ایک لینی ہے یا تو ابراہیم علیہ السلام کے سچ پر آنچ نہ آنے دیں اور یا رواۃ بخاری کو صحیح تسلیم کریں۔ دونوں صورتوں میں دوسری جانب مخدوش ہو جاتی ہے۔

انصاف یہ ہے کہ یہ جواب صحیح نہیں اور ایسی صورت نکل سکتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سچائی اور رواۃ بخاری کی صحت دونوں ثابت ہو سکتی ہیں اور ہم مجبور ہیں کہ حدیث مذکورہ میں تاویل کریں کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سچائی تو منصوص علیہا ہے ارشاد ہے واذکر فی الکتٰب ابراھیم انہ کان صدیقا نبیا ہ "صدیق" مبالغے کا صیغہ ہے، جب اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سچائی بطور مبالغہ بیان کرتا ہے تو ان کے حق میں کذب کا گمان بھی نہیں کیا جا سکتا۔ رہا یہ کہ حدیث میں تو صریح ثلاث کذبات کا لفظ آیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ کذبات کا اطلاق توریہ کی وجہ سے ہوا ہے۔ یعنی الفاظ سے جو معانی قریبہ مخاطب نے سمجھ لئے ہیں ان کے لحاظ سے تو کذب ہیں لیکن اس نفس الامر کے ساتھ جس کو ابراہیم علیہ السلام نے متصور کر لیا ہے ہو بہو مطابق ہے اور جو کلام نفس الامر کے ساتھ مطابق ہو وہ صدق ہوا کرتا ہے نہ کہ جھوٹ۔ تفصیل پہلے گذر چکی ہے

جوابِ دوم۔ ابن حزم نے ملل نحل میں لکھا ہے کہ کذب علی الاطلاق ممنوع نہیں بلکہ لاجل المصالح الدینیۃ دفع الضرر جائز ہے۔

امام غزالیؒ نے بھی احیاء العلوم میں حقیقت کذب کے بیان میں وضاحت سے بیان کیا ہے۔ مثلاً دوران جہاد میں از روئے حدیث کذب کا جواز متحقق ہے اسی طرح مصلحت طرفین اور بیوی کو خوش کرنے کے لئے کذب جائز ہے، اگر انی سقیم، نہ کہتے تو بت پرستی پر مجبور ہو جاتے اگر اُختی نہ فرماتے تو بیوی ہاتھ سے نکل جاتی۔

جوابِ سوم۔ امام راغب اصفہانی نے صدق و کذب کے متعلق جو بحث کی ہے اس سے ثلاث کذبات والی حدیث کا جواب مستنبط ہوتا ہے اور یہ راجح جواب ہے۔ امام نے فرمایا ہے الصدق والکذب یطلقان علی المقال والفعال، یعنی قول صادق اور کاذب، فعل

صادق اور کاذب بولا جاتا ہے قول صادق مطابق واقعہ اور کاذب غیر مطابق واقعہ ہوتا ہے، فعل صادق مطابق مقصد و نتیجہ اور کاذب غیر مطابق مقصد و نتیجہ ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے اذا وقعت الواقعۃ لیس لوقعتها کاذبۃ اور وقعت فعل ہے۔ لقد صدق اللہ رسولہ الرؤیا بالحق اور رؤیا فعل ہے جو اللہ کا دکھا وا ہے۔ جنگ بدر میں بعض صحابہ شریک نہ ہو سکے تو انہوں نے نذر مانی کہ ہم آئندہ جنگ میں جانفشانی سے لڑیں گے تو ان کے حق میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لقد صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ۔

عرب کہتے ہیں صدق فی القتال اذا وفی حقہٗ وکذب فی القتال اذا لم یوف حقہٗ۔ قتال میں جرأتمندانہ فعل والے کو صادق فی القتال کہتے ہیں اور بزدل کو کاذب فی القتال کہتے ہیں اسی طرح اذا لم یقطع کذب وصدق اذا قطع۔ مقامات حریری میں ہے فما کذبت ان جائت یعنی مجیئی کو عدم کذب کہا ہے۔ تو ان محاورات سے معلوم ہوا کہ صدق وکذب فعل میں بھی ہو سکتا ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ ہر وہ فعل جس سے مقصد پورا نہ ہو وہ کاذب ہے اور جس سے مقصد پورا ہو وہ صادق ہے۔ کذب فی القول مذموم ہے اور کذب فی الفعل مذموم نہیں کیونکہ مقصد کا پورا ہونا اللہ کی قدرت میں ہے۔ تو ابراہیم نے جو کچھ کیا وہ ذاتی غرض و مقاصد کے لئے فرمایا کہ نجات پاؤں گا مگر وہ مقصد پورا نہ ہوا آگ میں ڈالے گئے۔ بادشاہ مصر نے حضرت سارہ سے دست درازی کی گو وہ خاسر رہا تو جب مقصد پورا نہ ہوا۔ اس لئے حدیث میں ثلاث کذبات سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن حضور علیہ السلام نے صرف امورات گنوائے ثلاث کذبات حضور علیہ السلام کے الفاظ نہیں راوی نے روایت بالمعنے کی ہے۔ لم یتحقق الفعل الذی قال ابراھیم علیہ السلام ما قالہ لاجل ذالک الفعل۔

الاشکال الثالث۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک جلیل القدر پیغمبر ہیں مگر انہوں نے قدرت

علی الاحیاء میں شک کیا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر ڈھانٹ پڑی چنانچہ قرآن نے بیان کیا ہے
اذ قال ابراھیم ربِّ ارنی کیف تحی الموتیٰ قال اولم تؤمن قال بلیٰ ولٰکن
لیطمئنَّ قلبی قال فخذ اربعۃً من الطیر" آہ "

الجواب الاوّل۔ آیت مذکورہ سے شک فی قدرۃ الاحیاء معلوم نہیں بلکہ یقین علیٰ قدرۃ الاحیاء ثابت ہوتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کو علیٰ قدرۃ الاحیاء علم الیقین حاصل تھا جیسا کہ قال بلیٰ اس پر دال ہے ان کی درخواست عین الیقین کے لئے تھی، چاہتے تھے کہ کیفیت احیاء کا منظر دیکھوں جیسا کہ فرمایا ارنی کیف تحی الموتیٰ۔ اور علم الیقین کے ساتھ شک جمع نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا حضرت ابراہیم کی شان شک فی قدرۃ الاحیاء کے داغ سے پاک ہے۔

رہا یہ کہ بخاری وغیرہ میں حدیث آئی ہے نحن احق بالشک من ابراھیم۔ تو شارحین سے ابن حجر عسقلانیؒ نے یہ بیان کیا ہے کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ انہ لم یشک ولو شک کنا احق بالشک منہ۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کلام کے سوق سے ابراہیم علیہ السلام کے شک کی انتفا ثابت ہوتی ہے یعنی اگر ایک نبی کو شک فی الاحیاء کی اجازت ہوتی تو میں نبی ہوں اور میں شک کرتا مگر تم کو معلوم یقین ہے کہ قدرۃ علی الاحیاء پر مجھے کوئی شک نہیں تو ابراہیم نے بھی کوئی شک نہیں کیا۔ انتساب الشک الی ابراھیم ثم لما یکن اذا کان کمالاً لکون کو نہ کمالاً باطل فالانتساب الیہ کذالک۔ تو یہ نفی شک کے لئے تعبیر بلیغ ہے اور نفی شک از حضور علیہ السلام سے نفی شک از ابراہیم علیہ السلام پر استدلال ہے اور اس تفصیل میں معنی تفضیلی مراد نہیں تو معنی یوں ہوگا لو کان الشک صحیحاً بحقنا لکان صحیحاً بابراھیم۔

یہ ترکیب "الشتاء ابرد من الصیف" کے قبیل سے ہے۔ اھم خیر ام قوم تبع" میں بھی خیر کا معنی تفضیلی نہیں یعنی دونوں میں نیکی نہیں ہے اور یہ معنی نہیں کہ ایک قوم میں نیکی،

زیادہ ہے، اور دوسری میں کم۔

عصمت لوط علیہ السلام پر اشکال

آپ نے اپنی قوم کے اشرار کو جواب دیتے ہوئے فرمایا۔ ھٰؤلاء بناتی ان کنتم فاعلین

تو معترضین اعتراض کرتے ہیں کہ یہ تعریض بنات للزنا ہے۔

الجواب الاول۔ امام رازیؒ نے لکھا ہے کہ اس سے مراد عرض بنات نہیں بلکہ اظہار تقبیح لواطت ہے۔ یعنی یہ لواطت میرے نزدیک ایسا قبیح فعل ہے کہ جیسے کہ میری بنات سے بدفعلی ہو اور تم جانتے ہو کہ یہ کام میرے نزدیک قبیح ہے تو لواطت بھی قبیح ہے تم تو زنا مع بناتی نہیں کرتے۔ لہٰذا یہ لواطت بھی نہ کرو۔

الجواب الثانی۔ ابن حزمؒ نے ملل نحل میں عرض بنات کی توجیہ یہ کی ہے کہ اس عرض بنات سے مراد تزویج و نکاح ہے اور کافر کے ساتھ مسلمہ کا نکاح جائز تھا بلکہ ابتدائے اسلام تک جائز رہا۔

الجواب الثالث۔ قاضی بیضاوی اور ابو سعود نے یہ جواب دیا ہے کہ بنات سے مراد بنات القوم ہیں اور یہ بھی نکاح کے لئے عرض تھا۔ یقول شیخ القریۃ لبنات القوم ھٰؤلاء بناتی

الجواب الرابع۔ وازواجہ امھاتھم وھو اب لھم۔ ہر پیغمبر امت کا باپ ہوتا ہے اسی وجہ سے امت کی لڑکیاں پیغمبر کی بیٹیاں سمجھی جاتی ہیں۔

الجواب الخامس۔ بنات سے مراد قوم کی بیویاں ہیں یعنی تمہارے گھر کی بیویاں میری لڑکیاں ہیں ان سے کام لو۔ ان بیویوں پر بنات کا اطلاق اظہار شفقت کے لئے ہے۔

عصمت یوسف علیہ السلام پر اشکالات

اشکال اوّل ۔ عدم استخبار والدین ہے ۔ یعنی حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر میں حکومت پر فائز ہونے کے ابتدائی دوران میں ماں باپ کی خبر گیری نہیں فرمائی ۔ باوجودیکہ آپ کے والدین کنعان میں بہ قید حیات تھے ۔

جواب نمبر ۱ ۔ لعدم العلم بهما لتبائن المملكة فلما علم بهما ضمهما اليه ، لیکن یہ جواب ضعیف ہے کیونکہ قحط کے دوران بھائیوں کے آنے جانے سے پتہ چلا تھا ۔

جواب نمبر ۲ ۔ ان کا عدم استخبار منشائے الٰہی کے تحت تھا جب اللہ نے چاہا تو ان کو بلا کر یوسف علیہ السلام نے اپنے ساتھ ملایا ۔

اشکال دوم ۔ یوسف علیہ السلام نے قید سے رہا کئے ہوئے ساتھی سے فرمایا ،، اذكرنی عند ربك ،، اور یہ غیر اللہ پر اعتماد ہے جو ان کے شایان شان نہیں کیونکہ یہ بادشاہ وقت سے رہائی کا سوال ہے اور رہا ہونے والے سے یاد دہانی کا ۔

جواب یہ ہے ۔ کہ یہ تمسک بالاسباب الجائزہ ہے اور یہ جائز ہے ۔

اشکال سوم ۔ حضرت یوسف علیہ السلام سے اللہ کا ذکر چھوٹ گیا جیسا کہ خود قرآن مجید بیان کیا ہے ۔ فانسٰه الشيطٰن ذكر ربه فلبث فی السجن بضع سنين ۔

جواب نمبر ۱ ۔ ضمیر منصوب متصل کا مرجع علی الاختیار رہائی پانے والا نوجوان ہے یعنی وہ نوجوان بادشاہ کے پاس یوسف علیہ السلام کا تذکرہ بھول گیا ۔

جواب نمبر (۲) بالفرض مرجع ضمیر اگر یوسف علیہ السلام بھی ہو تو بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ

رب سے مراد پروردگار ہے اور خدا کے ہاں نسیان انبیاء گناہ نہیں۔

اشکال چہارم۔ ولقد همت به وهم بها لولا ان رأى برهان ربه ھم سے بظاہر شبہ پڑتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی طبیعت مائل ہوگئی تھی اور یہ ان کو زیب نہیں دیتا۔

جواب نمبر (۱) ھم دوم متعلق بالبعید ہے یعنی اگر برہان رب نہ ہوتا تو ھم کرتے لیکن برہان رب دیکھ لیا لہٰذا ھم نہ ہوا۔

جواب نمبر (۲) اگر ھم ثانی متعلق بالبعید نہ بھی ہو تو بھی اعتراض کی گنجائش نہیں کیونکہ دونوں ہموں میں فرق ہے بایں طور کہ ھم اول سے مراد ھم جلب مراد ہے اور ھم دوم سے مراد دفع اور دونوں میں فرق بالکل واضح ہے اور دلیل فرق یہ ہے کہ دونوں ھموں کو جدا جدا ذکر ذکر کیا اگر ایک نوعیت کے ہوتے تو ھما بصیغہ تثنیہ ذکر کیا جاتا نیز واؤ عطف مغائرت پر دلالت کرتا ہے

جواب نمبر (۳) ھم یوسف علیہ السلام میلان طبعی پر محمول ہے اور یہ عصمت کے منافی نہیں اور ھم اول سے مراد دوسرے قرائن کی وجہ سے مقصود خاص ہے لہٰذا یہاں تاویل کی چنداں ضرورت نہیں۔ روزہ دار ٹھنڈے پانی کو چاہتا ہے اور اس کی طبیعت پانی کی طرف میلان رکھتی ہے مگر یہ میلان زیادہ اجر کا موجب ہے

(تنبیہ)

برہان رب سے مراد چار چیزیں علی سبیل البدلیۃ لی گئی ہیں۔

(۱) مشاهدة تستر امرأة العزيز للصنم۔ یعنی زلیخا نے جو ایک بت پرست عورت تھی اپنی بت پر پردہ ڈال دیا تو یوسف علیہ السلام نے خیال کیا کہ مجھے چاہیئے کہ علام الغیوب سے حیا کروں۔

(۲) اس وقت حضرت یعقوب علیہ السلام ہاتھ کاٹتے ہوئے نمودار ہوگئے تھے۔

(۳) نور نبوت۔ علامہ محمود آلوسی نے اس وجہ کو ترجیح دی ہے۔
(۴) تذکر انعامات و تربیت عزیز۔ یعنی نمک حرامی کا مانع ہونا جس حرم میں پالا پھولا گیا ہوں اس کی عصمت پر کیونکر ہاتھ ڈال سکتا ہوں۔ یہ چاروں وجوہ تفسیر کبیر اور روح المعانی میں بیان کی گئی ہیں۔

اشکال پنجم۔ یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کے خورجین میں سرکاری پیمانہ تو خود رکھا اور چوری کا الزام ان پر لگایا جو شان پیغمبر کے خلاف کام ہے۔

جواب ۱۔ خود یوسف علیہ السلام نے بھائیوں پر چوری کا الزام نہیں لگایا بلکہ حکومت کے ایک کارندے نے یہ کام کیا ہے چنانچہ قرآن کا ارشاد ہے۔ فاذّن مُؤذّن ایتھا العیر انکم لسارقون۔ قرآن نے کسی مؤذن کا ذکر کیا ہے۔ یوسف ؑ کا تعین نہیں کیا لہذا الزام لگانے کی نسبت یوسف علیہ سلام کی طرف کرنا یوسف علیہ السلام پر الزام لگانا ہے اور واضح البطلان ہے۔

جواب ۲۔ اگر یہ قول یوسف علیہ السلام کی طرف منسوب کیا جائے تو بھی حرج نہیں کیونکہ اس چوری سے مراد پیالہ کی چوری نہیں بلکہ باپ سے بیٹے کی چوری مراد ہے

(ازالۃ الاشکال)

عقل تسلیم نہیں کرتی کہ بغیر اجازت یوسف علیہ سلام کے ان کے بھائیوں کے خورجین میں پیالہ رکھا گیا ہو تو فعل پر اشکال باقی ہے اور اسے قرآن مجید نے کید سے تعبیر کیا ہے۔

الجواب۔ کید سے مراد تدبیر حقی ہے۔ انھم یکیدون کیداً واکید کیداً۔ اور تدبیر مطلقاً مذموم نہیں بلکہ تدبیر کا حسن و قبیح مقصود کے تابع ہیں اگر تدبیر کا مقصود حسن ہو تو تدبیر حسن ورنہ قبیح۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس تدبیر سے یوسف علیہ السلام کا کیا مقصد تھا؟

قرآن اور تاریخ گواہ ہیں کہ اس تدبیر سے مقصود اپنے خاندان کو فائدہ پہنچانا تھا۔ چنانچہ یوسف علیہ السلام نے والدین اور بھائیوں کو بلا کر ملک مصر ان کے ہاتھ میں دے دیا تاکہ طویل زمانے کی مفارقت کا تدارک ہو جائے اور یہ ایک نیک مقصود ہے۔ کذالک لنصرف عنہ السوء والفحشاء، یوسف علیہ السلام سے گناہ شرعی اور گناہ عقلی دور رکھا گیا تھا۔

اشکال ششم۔ پیغمبر کے شایان شان نہیں کہ وہ عورتوں کے سامنے آجائے خصوصاً جبکہ عورتیں بے پردہ ہوں۔

جواب ۱۔ پردہ کا قانون شریعت یعقوب علیہ السلام میں نہیں تھا بلکہ ابتدائے اسلام کے زمانے تک نافذ نہیں ہوا تھا۔ ۵ھ ولیمہ زینب کے موقع پر آیا۔

جواب ۲۔ خروج یوسف علیہ السلام بغرض دیدار نہیں تھا بلکہ کسی کام کی تکمیل کے لیے تھا۔ لہٰذا اشکال کی گنجائش نہیں۔

اشکال ہفتم۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام خود تبریہ نفس نہیں کرتے تو ہم ان کو کیوں معصوم سمجھیں۔ جیساکہ فرمایا۔ وما ابرئ نفسی ان النفس لامارۃ بالسوء،

جواب ۱۔ آیت کا پہلا حصہ کسر نفسی پر محمول ہے جیساکہ ارشاد ہے۔ فلا تزکوا انفسکم۔ اور دوسرے حصے سے مراد نفس یوسف نہیں بلکہ عام نفوس مراد ہیں۔

جواب ۲۔ اگر ان النفس آہ میں نفس یوسف علیہ السلام داخل ہو تو بھی حرج نہیں کیونکہ نفس آمر تو ہے لیکن یوسف علیہ السلام اس کے امر پر نہیں چلتا۔ مجاہدہ یہ ہے کہ نفس امر کرے اور انسان اس کے خلاف چلے اور یہ انسانی کمال ہے۔

اشکال ہشتم۔ قال اجعلنی علیٰ خزائن الارض آہ، یعنی یوسف علیہ السلام نے بادشاہ مصر سے وزارت مال کی درخواست کی جس سے مندرجہ ذیل شبہات پیدا ہوتے ہیں

(۱) حرص مال (۲) اظہار تزکیہ نفس (۳) کافر گورنمنٹ کی ملازمت۔

جواب از شبہ اوّل۔ اس آیت میں کوئی ایسا لفظ نہیں جو حرص مال پر دلالت کرتا ہو اور اس عہدے کو سنبھالنا یوسف علیہ السلام اس لئے چاہتا تھا کہ تحفظ حقوق عوام کر سکے۔ کیونکہ اس پوسٹ پر نا اہل کا فائز ہونا اس کے لئے ظلم پر ابھارنا ہے۔ لہذا یوسف علیہ السلام کی درخواست عدل وانصاف کے واسطے راستہ ہموار کرنا ہے یہ درخواست درحقیقت حب عدل وانصاف کی دلیل ہے۔

جواب از شبہ دوم۔ یوسف علیہ السلام نے اپنی اہلیت حقہ کا اظہار کیا اور یہ درست ہے بلکہ ضرورت کے وقت ظاہر کرنا ضروری ہے، اظہار قابلیت برائے فخر وتکبر ناجائز ہے۔ اور انہوں نے ایسا نہیں کیا۔

جواب از شبہ سوم۔ وہ بادشاہ مسلمان ہو گیا تھا اور اگر کافر بھی ہو تو کافر بادشاہ کی نوکری مذموم نہیں نوکری مقصد کے تابع ہے اگر نوکری کا مقصد مذموم ہے تو نوکری بھی مذموم ہے ورنہ نہیں۔ شاہ عبد العزیز صاحب رحؒ نے فتویٰ دیا ہے کہ اگر ملازمت کے فرائض خلاف شرع نہ ہوں تو وہ ملازمت جائز ہے گو وہ کافر گورنمنٹ کی ہو۔ یوسف علیہ السلام کی وجہ سے قحط کے زمانہ میں بہت فائدہ ہوا تھا۔

(خارجی سوال) ان کیدکن عظیم۔ فقاتلوا اولیاء الشیطن ان کید الشیطن کان ضعیفاً ﷺ۔ پہلی آیت سے عورتوں کا مکر وفریب عظمت سے متصف ہوا ہے اور دوسری آیت میں شیطان کا مکر ضعف سے موصوف ہے جس سے معلوم ہوا کہ عورتیں بحیثیت مکر وفریب کے شیطان سے زیادہ ہیں۔

الجواب۔ عورتوں کے مکر کی عظمت بہ نسبت رجال ہے اور شیطان کے مکر کا ضعف

بہ نسبت قدرت رحمٰن ہے، یہ مطلب نہیں ہے کہ عورتوں کا مکر شیطان کے مکر سے بڑھا ہوا ہے۔

اشکال نمبر۹۔ وَخَرُّوا لَهُ سُجَّدًا۔ والدین یوسف علیہ السلام اور اخوان یوسف نے یوسف علیہ السلام کے سامنے سجدہ کیا اور یہ شان نبی کے خلاف ہے۔

جواب ۱۔ شریعت یعقوب علیہ السلام میں سجدہ بغرض تعظیم جائز تھا ہماری شریعت میں حرام ہے۔

جواب ۲۔ یہ خاص اور راجح ہے۔ ابن حزم نے ملل نحل اور آلوسی نے روح المعانی میں نقل کیا ہے کہ یہاں سجدے سے مراد وضع الجبہۃ علی الارض نہیں بلکہ سجدہ بمعنی اللغوی، تعظیم کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ ترى الاكم سجدا للحوافر۔

جواب ۳۔ آلوسی نے ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کان السجدة لله وتشكرا ليوسف لام ہملیتہ مسجود پر داخل نہیں ہوتا بلکہ کبھی سبب سجدہ پر بھی داخل ہوتا ہے۔ خَرُّوا سے مراد سقوط علی الارض نہیں بلکہ مرور مراد ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے، لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا وَعُمْيَانًا، ای لم یمروا۔

اشکالات بر عصمت موسیٰ علیہ السلام

عصمت موسیٰ علیہ السلام پر تین اشکالات وارد کی گئی ہیں۔

(۱) ان کی والدہ کے متعلق ہے جو فَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوسٰى فٰرِغًا، سے گھڑ لیا گیا ہے معترضین نے یوں ترجمہ کیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا دل خوشی سے خالی رہا حالانکہ من جانب اللہ اس سے وعدہ کیا گیا تھا، اِنَّا رَادُّوْهُ اِلَيْكِ، تو اس وعدہ خداوندی کے ہوتے ہوئے مغموم

رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ اسے وعدۂ الٰہی پر اعتماد نہیں تھا جو لائق شان والدۂ موسیٰ نہیں
جواب یہ ہے۔ ابن حزم نے ملل نحل میں لکھا ہے کہ یہ ترجمہ غلط ہے صحیح ترجمہ یہ ہے،
فارغا من الھم من موسیٰ، یعنی جب وعدۂ الٰہی مل گیا تو اس کا دل موسیٰ علیہ السلام کے غم سے فارغ ہوا اور کوئی کھٹکا نہ رہا۔

اشکال دوم، سوم خود موسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہیں۔ ایک اشکال یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے تورات اور اپنے بڑے بھائی کی بے ادبی کی ہے، مستشرقین نے اس آیت، فالقی الالواح واخذ برأس اخیہ یجرہ الیہ، کا معنی تختیوں کا پھینکنا اور پکڑ کر کھینچنا کیا ہے اور اس فاسد ترجمہ پر اشکال کی بنیاد رکھدی ہے۔

جوابؑ۔ القی الالواح، کا معنی پھینکنا نہیں بلکہ رکھدینا ہے، موسیٰ علیہ السلام بھائی کو پکڑنے کے لئے ہاتھوں کو خالی کرنا چاہتے تھے، اس لئے انہوں نے توریت کی تختیاں رکھدیں تو رکھتے وقت اگر کوئی ایک تختی دو ٹوٹ گئی ہوں تو ہرج کی بات نہیں اور اخذ برأس اخیہ یجرہ الیہ، کا معنی ابن حزم نے ملل نحل میں یوں کیا ہے فاخذ برأس اخیہ لیقبلہ للخطاب، یعنی ہارون علیہ السلام کا رُخ دوسری طرف تھا تو موسیٰ علیہ السلام نے ان کے بالوں سے ہاتھ لگا کر اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتے تھے بے ادبی مقصود نہیں تھی،۔

جوابؑ، از علامہ استاذی شمس الحق صاحب افغانی رحمۃ اللہ علیہ، فرماتے ہیں کہ حق یہ ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ موسیٰ و ہارون علیہما السلام دونوں سگے بھائی تھے اور دونوں پیغمبر تھے ہارون علیہ السلام بڑے اور موسیٰ علیہ السلام کے نائب تھے اور ابن ام کا اطلاق از روئے شفقت ہے، موسیٰ علیہ السلام طور چلے گئے اور ان کے جانے کے بعد قوم گوسالہ پرستی کی لعنت میں گرفتار ہوگئی۔ ایک پیغمبر کے لئے جب کہ اس کی ساری کوششیں توحید کے لئے ہوا کرتی ہیں

غیر اللہ کا پوجنا بہت بڑے صدمے کا باعث ہوتا ہے اور اس حالت میں غضب کا طاری ہونا بہ حیثیت غیرۃ للہ اور بغض للہ لازمی ہے لہٰذا موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ فرمایا، یا کیا وہ سب دینی جذبہ کے تحت واقع ہوا ہے نہ کہ یہ نفسانی جذبات تھے۔ اس صورتحال میں کہ بنی اسرائیل نے گوسالہ پرستی شروع کردی ہارون علیہ السلام اس پر راضی نہیں تھے اور اس برے فعل سے ان کو روکنا چاہا اور تبلیغ کی مگر قوم باز نہ آنے والی تھی باز نہ آئی۔

اب ہارون علیہ السلام کو چاہیئے تھا کہ کوہ طور جاکر موسیٰ علیہ السلام کو حقیقت الحال سے آگاہ کرتے اور بنی اسرائیل کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا چھوڑتے لیکن ہارون علیہ السلام نے اپنے اجتہاد کی بناء پر کہ اگر میں کوہ طور جاؤں تو شاید تیابت پر اعتراض آئے ایسا نہیں کیا اور موسیٰ علیہ السلام کو جو ان سے نبوت کے لحاظ سے افضل تھے خبردار نہ کرسکے جیسا کہ قرآن میں ہے ولم ترقب قولی، اور موسیٰ علیہ السلام نے اپنے اجتہاد کی بناء پر ہارون علیہ السلام پر دینی جذبات کے تحت غصہ کیا کہ تم نے کیوں مشرک قوم کے پاس وقت گذارا اور ہارون علیہ السلام نے اپنے اجتہاد سے کام لیکر مرکز کو چھوڑنا موزون نہ سمجھا، لہٰذا موسیٰ علیہ السلام سے کوئی ایسی بات یا کام واقع نہیں ہوا جس پر اعتراض کیا جاسکے اور ان کی عصمت داغ دار ہوجائے اور خواہ مخواہ بات بنانے کا علاج ہی نہیں۔

رہا یہ کہ توریت کی تختیاں ٹوٹ گئیں۔ یہ کام قصداً وعمداً نہیں کیا اللہ نے اختیاری الفاظ سے تعبیر صرف طانت کے طور پر فرمایا۔

دوسرا ۲ اشکال یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے ایک بے گناہ قبطی کو قتل کیا ہے جیسا کہ قرآن فرماتا ہے، فوکزہٗ موسیٰ فقضیٰ علیہ، اور موسیٰ علیہ السلام نے بھی اس قتل کا اقرار کیا ہے فقتلت نفسًا، اور قتل نفس شانِ پیغمبر کے خلاف ہے۔

جواب۔ یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے قبطی کو قتل کرنے کے غرض سے مکا رسید نہیں کیا بلکہ ایک مظلوم اسرائیلی کی امداد کرنا چاہتے تھے۔ جبکہ اس پر ظالم قبطی ظلم کر رہا تھا اور مظلوم کی امداد جائز بلکہ ضروری ہے یہ الگ بات ہے کہ پیغمبری مکا قبطی کا جان لیوا ثابت ہوا اور اپنی طرف نسبت قتل از روئے سببیت ہے، اور ضلال سے مراد فقدان النبوۃ ہے۔ لہذا موسیٰ علیہ السلام کی عصمت پر کوئی حرف نہیں آتی۔ رہا یہ اشکال کہ موسیٰ علیہ السلام نے باوجود اعتراض نہ کرنے کے وعدے کے باربار حضرت خضر پر اعتراض کرتے رہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اعتراض حالت نسیان میں ہوتا تھا جیسا کہ قرآن نے فرمایا، لاتؤاخذنی بما نسیت ، اور شک نہیں کہ نسیان قابل مواخذہ نہیں ، اور یہ اشکال کہ موسیٰ علیہ السلام نے دیدار الٰہی کا مطالبہ کیا حالانکہ دنیا میں دیدار الٰہی میسر ہو نہیں سکتی اور اس قسم کا سوال ممنوع ہے جیسا کہ بنی اسرائیل نے کیا اور ان کو بجلی نے پکڑ لیا۔

اسیطرح اگر یہ سوال جائز ہے تو بنی اسرائیل کو بجلی نے کیوں پکڑا اور اگر ناجائز ہے تو موسیٰ عم نے کیوں کیا۔

جواب ۱۔ یہ ہے کہ جس وقت موسیٰ علیہ السلام فرط محبت سے دیدار الٰہی کے طلبگار ہوئے اس وقت نہ یہ سوال ممنوع قرار دیا گیا تھا اور نہ دیدار الٰہی کے ناممکن ہونے کی کوئی نقلی دلیل موجود تھی۔ اور اس سوال کے بعد جب اس قسم کا سوال ممنوع قرار دیا گیا تو اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے یہ سوال نہیں دھرایا۔ لہذا اشکال کی گنجائش ہی نہیں اور بنی اسرائیل نے اَرِنَا اللّٰہَ جَھرۃً ، ممنوع ہونے کے بعد کہا ہے۔ لہذا فرق واضح ہوا۔

جواب ۲۔ علامہ آلوسی نے فرمایا ہے کہ اَرِنی انظر الیک اور اَرِنَا اللّٰہَ جَھرۃً ، الگ الگ

مقاصد رکھتے ہیں۔ پہلا قول فرط محبت اور شوق واشتیاق کا نتیجہ ہے اور دوسرا قول ضد اور تعنت کی پیداوار ہے۔ اس لئے دونوں قولوں میں فرق واضح ہے اور ایک دوسرے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

اشکال بر عصمت یونس علیہ السّلام

حضرت یونس علیہ السلام نینوا شہر کے رہنے والے تھے۔ آپ نے اپنے منصب کے فرائض ادا کرنے کے لئے اپنی قوم کو تبلیغ فرمائی لیکن خاطر خواہ اثر نہ ہوا۔ اللہ تعالےٰ کی طرف سے اس قوم پر عذاب آنے کا وعدہ ہوا لیکن عذاب آنے کی تاریخ متعین نہیں ہوئی تھی، اس سے قبل کہ موعود عذاب آتا اللہ تعالیٰ کے حکم سے پہلے اپنی قوم سے ہجرت فرما گئے۔

اب اشکال یہ پڑتا ہے کہ قرآن نے ان کے متعلق فرمایا ہے "اذ ذھب مغاضباً۔ فظنّ ان لن نقدر علیہ" اور انہوں نے خود فرمایا ہے "انی کنت من الظّالمین" ایک تو انہوں نے اللہ پر غصہ کیا۔ قدرۃ الٰہی کا اعتقاد نہیں رکھا اور ظلم کیا۔ یہ تینوں کام ایسے ہیں کہ جو شان نبوت سے بعید تر ہیں۔

جواب یہ ہے کہ ان شبہات کا پڑ جانا عربی لغت سے ناواقفیت پر مبنی ہے، قَدَرَ یَقْدُرُ قُدْرَۃً بمعنی قادر ہونا، قَدَرَ یَقْدِرُ قَدْراً بمعنی تنگ کرنا۔ قدر یَقدَرُ قدراً بمعنی اندازہ کرنا، آیت کریمہ میں دوسرا معنی مراد ہے۔

"اللہ یبسط الرّزق لمن یشاء من عبادہٖ ویقدر، ومن قُدِرَ علیہ رزقہ فلینفق ممّا اٰتاہ اللہ" اور مغاضباً، میں مغضوب علیہ کا ذکر نہیں لہٰذا وہ قوم ہے نہ کہ اللہ۔ اور ظلم کا معنیٰ ہے، "وَضعُ کلّ شئی فی غیر محلّہ" چونکہ یہ غصہ بے محل تھا اس لئے اس کو ظلم سے تعبیر کیا (روح المعانی)

یعنی ناگوار حالات پر تابو نہ پانے پر ناراض ہو گئے اور قبل اس کے کہ ان پر وحی آتی کہ قوم سے ہجرت کر لو ہجرت کر گئے اور شک نہیں کہ یہ بے محل غصہ تھا اور اس کو انہوں نے ظلم ٹھہرایا۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ اولیٰ تھا کہ حضرت یونس علیہ السلام اپنی قوم کے پاس رہتے۔ لیکن حضرت یونس علیہ السلام نے ایسا نہیں کیا اس لئے ان پر ڈھانٹ پڑی اور یہ شان نبوت کی برتری ہے۔

عصمت داؤد علیہ السلام پر اشکالات

داؤد علیہ السلام یہودا کے جو یعقوب علیہ السلام کے فرزندوں میں سے ہیں اولاد سے ہیں۔ حضرت داؤدؑ سے پہلے اسرائیلی خاندان میں نبوت اور حکومت تقسیم ہوتی تھی، نبوت یہودا کے خاندان اور حکومت افرائیل کے خاندان میں چلی آرہی تھی لیکن حضرت داؤدؑ میں نبوت اور حکومت دونوں جمع ہوئی تھیں۔ داؤد علیہ السلام کی حکومت خلیج عقبہ سے لیکر فرات تک پھیلی ہوئی تھی، عصمت داؤد علیہ السلام پر یہ اعتراض کیا گیا ہے جو موجودہ تورات کے ایک حصے صحیفہ اشموئیل سے ماخوذ ہے۔ قصہ کیا جاتا ہے کہ داؤد علیہ السلام اپنے بنگلے کی چھت پر چڑھ گئے دیکھا کہ حطی اوریا کی بیوی غسل کر رہی ہے دیکھتے ہی حضرت داؤد کو اس سے عشق ہوا۔ داؤد علیہ السلام نے اس کے خاوند کو جنگ میں بھیجدیا وہ وہاں مر گیا اور داؤد علیہ السلام نے اسکی بیوی کو اپنے نکاح میں لایا چونکہ یہ کام شان داؤدی کے خلاف تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے انہیں تنبیہ کرنے کے لئے دو فرشتے مدعی، مدعیٰ علیہ کے روپ میں داؤد علیہ السلام کے پاس بھیجدیئے جس کی تفصیل آیت نعاجہ میں ذکر ہے اور داؤد علیہ السلام کو بھی احساس ہوا چنانچہ ارشاد ہے: وَ ظَنَّ دَاوُدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ جواب یہ ہے کہ اس قصے سے تین ایسی خرابیاں لازم آتی ہیں جو ادنیٰ مومن کی شان کے خلاف ہیں

چہ جائیکہ پیغمبر ان خرابیوں کا مرتکب ہوجائے۔ (۱) زنا (۲) قتل مومن (۳) حیلہ۔
اس وجہ سے ابن کثیر نے لکھا ہے کہ یہ قصہ اسرائیلیات میں سے ہے۔ اور اسرائیلیات غیر معقول اور لغو خرافات ہیں۔

اس قصہ کے متعلق ابن حزم نے فرمایا ہے ولکذا ھا ذنا دقۃ الیھود۔

امام رازی نے کبیر میں کہا ہے۔ مکذوبۃ،

ابو حیان نے بحر محیط میں فرمایا ہے، موضوعۃ۔ اور اسی طرح شہاب الدین خفاجی نے بھی شفائے علیل میں کہا ہے۔

رہی آیت نعاجہ تو اس کی تین تفسیریں ہیں۔

(۱) ابن حزم نے کہا ہے کہ یہ دونوں شخص حقیقی مدعی اور مدعی علیہ تھے ملائکہ نہیں تھے اور قرآن مجید نے تقدس داؤدؑ کے لئے داؤد علیہ السلام کا ذکر کیا ہے مقدمات کے لئے تفصیلات مذکور نہیں چونکہ ایک حاکم اور جبکہ نبی بھی ہو مدعی، مدعی علیہ کا بیان سنتا ہے داؤد علیہ السلام نے بھی ایسا کیا اور جو جو اجزاء واضح تھیں ان کا ذکر نہیں کیا گیا۔ باقی داؤد علیہ السلام کے استغفار کی وجہ یہ ہے کہ داؤد علیہ السلام کا تصور یہ تھا کہ میری حکومت بہت پھیلی ہوئی ہے اور میں اس لمبی چوڑی حکومت میں برابر انصاف کرتا ہوں۔ لیکن جب یہ دو شخص رات کے وقت آئے اور صورتحال کو بیان کیا تو حضرت داؤد علیہ السلام سمجھ گئے کہ میرے عدل میں شاید قصور ہے مجھے چاہیئے کہ میں خود اندرون ملک کے حالات کا جائزہ لے لیا کروں۔ صرف اس تصور کی بناء پر حضرت داؤدؑ نے استغفار کیا اور یہ ایک بہت بلند مرتبہ ہے۔

دوسری تفسیر ابو مسلم اصفہانی نے کی ہے، توجیہہ یوں بیان کی ہے کہ یہ دونوں مدعی، مدعی علیہ انسان تھے جب مدعی نے اپنا بیان کہدیا تو داؤد علیہ السلام نے قبل ازیں کہ دوسرے شخص کا

بجاں سن لیتا مدعی کے حق میں فیصلہ کیا نہ تو انہوں نے گواہوں وغیرہ ضروریات دعویٰ کی تفتیش فرمائی اور نہ مدعیٰ علیہ کا بیان سنا۔ اس لئے سبقت لسانی کی وجہ سے استغفار فرمایا۔ نیز اس سے یہ علیحدہ مقصود تھا کہ فریقین میں ایک قسم جرأت پیدا ہو جائے کیونکہ داؤد علیہ السلام کے رعب سے رعایا مرعوب تھے۔

تیسری تفسیر حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ہے جسے حاکم نے نقل کی ہے۔ وہ یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنا وقت یوں تقسیم کر لیا تھا کہ رات دن کی ایک تہائی میں عبادت خداوندی کرتے تھے اور ایک میں مقدمات فیصلہ کرتے اور ایک میں گھر کے کاروبار انجام دیا کرتے تھے۔ اس تقسیم پر نازاں تھے کہ وقت اچھی طرح گذرتا ہے اور وقت کا کوئی حصہ ضائع نہیں ہونے پاتا۔ اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں کو بطور مدعی، مدعیٰ علیہ کے عین وقت عبادت میں بھیج دیئے۔ اس معاملہ سے مقصود یہ تھا کہ اللہ تعالےٰ یہ بتانا چاہتا تھا کہ اس تقسیم میں تیری مرضا کو دخل نہیں اس پر فخر نہیں کرنا چاہیئے بلکہ یہ محض میری توفیق سمجھنا چاہیئے

عصمت سلیمان علیہ السلام پر اشکال

اذ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الجِيَادُ فَقَالَ اِنِّيْ اَحْبَبْتُ حُبَّ الخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالحِجَابِ ۞ رُدُّوْهَا عَلَيَّ فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوْقِ وَالاَعْنَاقِ ۞ ص۔

ان آیتوں کی ایک تفسیر کے بناء پر سلیمان علیہ السلام کی عصمت پر جو اشکال وارد کیا گیا ہے اس کے دو جزو ہیں۔

(۱) گھوڑوں کی محبت کی وجہ سے ان سے نماز قضا ہوئی اور نماز کا قضا کرنا شان نبوت کے خلاف ہے

(ب) نماز ان سے قضا ہوئی اور سزا گھوڑوں کو دی کہ ان کو ذبح کر ڈالا۔
اس تفسیر کو مانتے ہوئے جز (۱) کا جواب یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے یہ گھوڑے جہاد میں استعمال کرنے کے لئے پالے ہوئے تھے اور ان کی دیکھ بھال عبادت تھی تو اگر ایک عبادت میں مشغول ہونے کی وجہ سے دوسری عبادت نسیاناً رہ جائے تو چنداں حرج نہیں۔ جز (ب) کا جواب یہ ہے کہ تصوف میں ایسے کام کو غیرت کہتے ہیں کہ جو چیز عبادت میں حائل ہو جاتی ہو اور اسے راہ خدا میں قربان کی جائے جیسا کہ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے اپنے باغ کو اس لئے قربان کیا کہ وہ نماز میں خشوع کا حائل ہوتا تھا۔ شریعت یعقوبی میں یوں کرنا بھی جائز تھا۔ ان آیتوں کی وہ تفسیر جس کو علامہ آلوسی اور ابن حزم نے پسندیدہ فرمایا ہے یہ ہے کہ عَن ذِكرِ رَبِّي میں "عَن" برائے تعلیل ہے، جیسا کہ حدیث میں آتا ہے "الخیر معقود فی نواصی الخیل"، اور تورات میں ضمیر گھوڑوں کی طرف راجع ہے سورج کی طرف نہیں اس لئے کہ سباق میں سورج کا کوئی ذکر نہیں۔ اور حجاب سے مراد اصطبل ہے اور "مسحًا بالسوق والاعناق" سے مراد گھوڑوں پر پیار و محبت سے ہاتھ پھیرنا ہے ذبح کرنا مراد نہیں۔ صافنات ان گھوڑوں کو کہتے ہیں جو تین پاؤں پر کھڑے ہوتے ہوں۔

عصمتِ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم

وما ارسلنا من قبلک من رسولٍ ولا نبیٍّ الّا اذا تمنّٰی القی الشیطٰن فی امنیّتہ فینسخ اللّٰہ ما یلقی الشیطٰن ثمّ یحکم اللّٰہ اٰیٰتہ، آیت ۵۲، ج،

مفسرین نے اس آیت کے تحت حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سند کے ساتھ قصہ غرانیق نقل کیا ہے، غرانیق، غرنیق کی جمع ہے اور غرنیق ایک خاص قسم پرندہ کا نام ہے جو، جوہڑوں اور تالابوں میں بستا ہے، واقعہ یوں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ نجم کی آیت 'افرأیتم اللّٰت والعُزّٰی ومناۃ الثالثۃ الاخرٰی تلاوت فرمائی تو شیطان نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آواز میں اپنی آواز ملا کر کہنے لگا، تلک الغرانیق العُلٰی وانّ شفاعتھن لترتجٰی، غرانیق سے شیطان کا مطلب بُت ہیں تو اللہ تعالیٰ نے نبی کرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لئے یہ آیت نازل فرمائی۔

چونکہ یہ قصہ عصمت نبوت کے خلاف ہے اس لئے اس سے دو طریقوں پر جواب دیا جاتا ہے (۱) جواب الانکار۔ (۲) جواب الاثبات۔ انکار کی وجہ یہ ہے کہ اگر یہ واقعہ درست مانا جائے تو وحی مشکوک ہو جاتی ہے، بیہقی فرماتے ہیں ھٰذا القصّۃ لااصل لھا۔ قاضی عیاض شفائے علیل میں لکھتے ہیں لم یثبت بسند صحیح سلیم متصل،

ابو حیان نے بحر محیط میں محمد ابن اسحاق سے نقل کیا ہے، ھٰذہٖ ولدھا زنادقۃ الیھود، نسیم الریاض شرح قاضی عیاض میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے کہ یہ قصہ کتب احادیث میں نہیں نہ ستہ میں اور نہ غیر ستہ، مخالفین اسلام نے یہ قصہ صرف اس لئے گھڑ لیا ہے کہ اسلام میں

طعن کے لئے راستہ ہموار ہو جائے لیکن علمائے اسلام نے ایسا نہیں ہونے دیا اور اس قصہ کی مردودیت پر نصوص قرآن اور اقوال سلف پیش کئے۔

نصوص قرآن میں سے نص اوّل۔ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ۔ یہ آیت واضح طور پر دلالت کرتی ہے کہ عبد صالح پر شیطان کا غلبہ نہیں تو رسول برحق پر شیطان کا غلبہ کیسے ممکن ہے

نص دوم، لَا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِیْلٌ مِّنْ حَکِیْمٍ حَمِیْدٍ ۝ قرآن میں کسی جہت سے بھی باطل گھس نہیں سکتا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ سورۂ نجم پڑھتے وقت پیغمبر اسلام کی قرأۃ میں شیطانی القار داخل ہو گئی ہو۔

نص سوم، عَالِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ، لِیَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ، آہ۔

اس آیت کا مفاد یہ ہے کہ وحی الٰہی ملائکہ کی نگرانی میں نازل ہو جاتی ہے تا کہ اس میں شیطانی القار کا احتمال ہی نہ رہے۔

علمائے فرمایا ہے کہ یہ قصہ بوجوہات ذیل مردود ہے۔

وجۂ اوّل۔ یہ قصہ مقصد نبوت کے خلاف ہے، مقصد نبوت یہ ہوتا ہے کہ لسان نبوت معتبر اور غیر مشتبہ ہو لیکن اگر یہ قصہ درست مانا جائے اور لسان نبوت پر کلمات شیطانی کے اجرار کا شبہہ ہو تو تلبیس بین الحق والباطل ہو جائے گی اور اس صورت میں مقصد نبوت فوت ہو جاتا ہے۔

وجۂ دوم۔ اس قصہ کے پیش نظر عصر نبوت میں کسی نے اعتراض نہیں کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ قصہ من گھڑت ہے۔ اگر یہ قصہ واقعی ہوتا تو اعدار نبوت عصر نبوت ہی میں ضرور اعتراض کرتے کیونکہ عقلاً واضح ہے کہ عصر نبوت میں جب کہ غالب اکثریت منی مخالفین

نبوت کی تھی۔ اس کلمات شرکیہ کی بناء پر اعتراض کیا گیا ہوتا مگر یوں نہیں ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ مردود اور غیر واقعی کہانی ہے۔

ازالۃ الاشکال۔ صحیحین میں روایت ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ نجم کی قرأت کے دوران آیت سجدہ پڑھ لی تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، مومنین اور مشرکین سجدہ کرنے لگے، مشرکین کے سجدہ سے ثابت ہوتا ہے کہ مشرکوں نے اپنے معبودان باطلہ کی تعریف سن کر خوشی کی وجہ سے سجدہ میں گر گئے۔ اس اشکال کے ۲ دو جواب ہیں۔

جواب اوّل. شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ مشرکوں کا یہ سجدہ علیٰ طریق الجذب واقع ہوا تھا۔ یعنی جس مجلس میں سورۃ نجم کی تلاوت ہوگئی تھی اس مجلس کی کشش قرآن کی برکت اور حضورؐ کی صحبت کے اثر سے ان میں اضطراب پیدا کیا اور سجدہ کرنے پر آمادہ ہوئے۔ جواب ۲ ثانی یہ ہے۔ کہ ہر فعل اجتماعی کا اثر ہوتا ہے کہ مخالف بھی چار و ناچار دالستہ طور پر بھی اس کام میں شریک ہو جاتا ہے۔

ایک دفعہ مجھے بازار قصہ خوانی سے گذرنا پڑا تو دیکھا کہ اس بازار کا نام دال ہے۔ ایک قصہ گو قصہ سنا رہا تھا کہ حضرت علیؓ اور ایک کافر کے درمیان زور آزمائی کا مقابلہ تھا اس کافر نے ایک ہزار من لوہے کا ایک گرز اٹھایا۔ نغانی؟

،، دعا کرو کہ خداوند کریم حضرت علیؓ کو اس میدان میں کامیاب کرے ،،

سب لوگوں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا لئے اور میں بھی یوں کرنے لگا۔ مجلس ختم ہونے کے بعد مجھے خیال آیا کہ ایک تو ایک ہزار من لوہے کا گرز اٹھانا انسانی طاقت سے باہر ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ واقعہ سینکڑوں سال پہلے کا ہے اس وقت حضرت علیؓ کی کامیابی کے لئے دعا کی کیا ضرورت ہے اور میں نے دعا کیوں مانگی؟ الغرض فعل اجتماعی کو اثر ہوتا ہے۔ مشرکوں نے فعل اجتماعی

سے متاثر ہو کر سجدہ کیا اس وجہ سے نہیں کہ انہوں نے معبودان باطلہ کی تعریف سنکر سجدہ کیا، کیونکہ معبودان باطلہ کی تعریف پیغمبر کے مشن کے خلاف ہے اور کوئی بھی پیغمبر اپنے مشن کے خلاف کوئی کام نہیں کرتا ہے۔

جواب الاثبات یہ ہے کہ یہ قصہ واقعی ہے مگر تلک الغرانیق العلیٰ ۔۔۔ کے الفاظ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نہیں نکلے بلکہ کسی انسی یا جنی شیطان نے اپنی آواز کو حضورؐ کی آواز کے مشابہ بنا کر کے یہ الفاظ کہدیئے اور مشرکین نے غلط طور پر سمجھا کہ ہمارے معبودوں اور دین کی تائید ہوئی اور سجدہ میں گر گئے۔

یہ جواب علامہ آلوسی نے روح المعانی میں دیا ہے۔ اس جواب سے عصمت نبوی پر حرف نہ آسکا۔ چونکہ یہ الفاظ جزو سورۃ نجم نہیں ہیں تو تلبیس بین القرآن وغیرہ کا شبہہ بھی نہ رہا عینی اور دیگر محققین نے کہا ہے کہ غرانیق سے مراد اصنام نہیں بلکہ ملائکہ ہیں چونکہ ملائکہ پر رکھتے ہیں اس وجہ سے بطور استعارہ غرانیق سے مراد ملائکہ ہے۔ ملائکہ کی شفاعت شرعاً درست ہے اور یہ آیت منسوخ التلاوۃ ہے۔

آیۃ کی تفسیر۔ اس آیت میں "اذا تمنّیٰ" آیا ہے جو تمنّی سے ماخوذ ہے تمنی کا معنی آرزو ہے گو تمنی کا معنی قرأۃ بھی آتا ہے لیکن قلیل الاستعمال ہے۔ تمنّیٰ کا تفصیلی معنی ہے "ما یقدر التمنی حصولہ فی القلب"

قرآن مجید میں آیا ہے، فتمنّوا الموت۔ ولا یتمنّونہ۔ ام للانسان ما تمنّیٰ"
اس تمہید کے بعد آیت کا معنی یوں ہوگا کہ نبی تو دل میں لوگوں کی ہدایت کی آرزو رکھتا ہے اور پیغمبر کے اعداء شیطانیہ لوگوں کے دلوں میں پیغمبر کے خلاف شکوک ڈالتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ پیغمبر کو تسلی دیتے ہیں اور شکوک و شبہات ختم کر دیتا ہے، شیطان لوگوں کے دلوں میں شکوک

وشبہات ڈالتا ہے۔ یہ بات اس آیت سے واضح ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،
وکذالک جعلنا لکل نبیٍ عدوا الانس والجن یوحی بعضھم الیٰ بعض زخرف
القول غرورا۔

اور اللہ تعالیٰ شکوک وشبہات کا ازالہ فرماتا ہے چنانچہ جب یہ آیت، انکم وما تعبدون
من دون اللہ حصب جہنم ڈ ۵، نازل ہوئی اور حضورؐ نے تلاوت فرمائی تو شیطان
نے لوگوں کے دلوں میں شک ڈال دیا کہ عیسیٰ علیہ السلام اور ملائکہ کی بھی عبادت کی گئی ہے
اور جب یہ حضرات جہنم میں جائیں گے تو ہم کون ہیں۔ اس شبہہ کا ازالہ اللہ نے اس آیت
سے فرمایا۔ ان الذین سبقت لھم منا الحسنیٰ اولئک عنھا مبعدون؛ ویسے بھی عیسیٰ
علیہ السلام اور ملائکہ ما تعبدون، کا مصداق نہیں بن سکتے کیونکہ ما عموماً غیر ذی
العلم میں استعمال ہوتا ہے پھر بھی اللہ تعالیٰ صراحتاً اس شبہہ کا ازالہ فرمایا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

عصمت خاتم الانبیاء پر دوسرا اشکال اور اس کا جواب

واذ تقول للذی انعم اللہ علیہ وانعمت علیہ امسک علیک زوجک واتق
اللہ وتخفی فی نفسک ما اللہ مبدیہ وتخشی الناس، واللہ احق ان تخشاہ ڈ
فلما قضیٰ زید منھا وطراً زوجنٰکھا لکی لا یکون علی المؤمنین حرج فی ازواج
ادعیائھم اذا قضوا منھن وطراً ڈ وکان امر اللہ مفعولاً ڈ سورۃ احزاب پ ۲۲،،

اس آیت کریمہ میں بعض الفاظ وارد ہیں ان کا غلط ترجمہ کر کے اور خود ساختہ تفسیر کو
پیش کر کے مستشرقین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عصمت کو مخدوش بنانے کی ناکام کوشش
کی ہے۔ اس آیت میں ایک واقعہ کا بیان ہے جس کا ہونا مسلمانوں کے لئے آسانی کا باعث

بنا اور کافر دل کی ایک قدیم رسم اس سے مٹ گئی۔

ہوا یوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پھوپھی زاد بہن زینب رضؓ بنت جحش کا نکاح زید بن حارثہ رضؓ سے کیا۔ زید بن حارثہ رضؓ حضور کا متبنیٰ تھا حتیٰ کہ زید بن محمد سے پکارا جاتا تھا۔ زید بن حارثہ اگرچہ حُر تھے لیکن اہل مکہ کے عرف میں آزاد کردہ غلام سمجھا جاتا تھا عرب کے ہاں یہ عار جانا جاتا تھا کہ ایک غلام کے ساتھ قریشی لڑکی کا نکاح کیا جائے۔ اسی وجہ سے زید بن حارثہ اور زینب بنت جحش کا گھر نہ بنا اور آخرکار طلاق دینے تک نوبت پہنچی۔ زینب بنت جحش کو طلاق ملنے کے بعد حضورؐ نے اللہ تعالیٰ کے منشا کے مطابق اپنے نکاح میں لایا اور یہ رسم کہ عرب متبنیٰ کی مطلقہ سے نکاح کرنا نسبی بیٹے کی مطلقہ سے نکاح سمجھتے تھے ختم ہوا۔ مستشرقین نے اسلام دشمنی کے خاطر مندرجہ ذیل طعن کئے جو سراسر غلط ہیں۔

(۱) اس نکاح کا محرک زینبؓ کے ساتھ آپ کا محبت تھا۔

(۲) "امسك زوجك" کی تلقین اور "وتخفی فی نفسك" خواہش کا وجود تلوّن ہے جو شان پیغمبری کے خلاف ہے کیونکہ ظاہر و باطن یکساں نہیں ہیں

(۳) "وتخشی الناس" صاف دلالت کرتی ہے کہ پیغمبر اسلام غیر اللہ سے ڈرتے ہیں اور یہ اسلام کے تعلیمات کے خلاف ہے۔

پہلے اشکال کا جواب یہ ہے۔ کہ یہ سراسر اسلام دشمنی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹا الزام ہے کہ زینب رضؓ کے ساتھ نکاح کا محرک اس سے آپ کا محبت تھا۔ قرآن نے صاف بتا دیا ہے "لکیلا یکون علی المؤمنین حرج فی ازواج ادعیائھم" اس نکاح کا محرک اللہ تعالیٰ نے ایک بڑے رسم کا مٹانا قرار دیا ہے۔ اس محرک کے ساتھ ساتھ اگر جائز محبت ہو تو یہ قابل اعتراض بات نہیں۔ دوسرے اشکال کا جواب یہ ہے۔ کہ تلوّن کے وجود پر کوئی دلیل نہیں جیسا کہ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم مشورے کے طور پر "امسک" کی تلقین فرماتے تھے ویسے قلب شریف میں بھی تھا لیکن جب زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ مشورے پر عمل نہ کر سکے (جیساکہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا نے خیار عتق کے رو سے اپنے شوہر کے ساتھ رہنے پر الگ ہو جانے کو ترجیح دی اور اپنے خاوند کو روتا ہوا چھوڑا) اب حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے دو عار منسوب ہوئے (۱) غلام سے نکاح (۲) غلام کی طلاق۔ چونکہ یہ واقعہ حضرت زینب کے لیے سوہان روح تھا (اور پہلے صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کے لیے حضرت زینب رضی اللہ عنہا اور عبداللہ بن جحش نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے نکاح بادل ناخواستہ قبول کیا تھا کیونکہ یہ خاندانی اور ملکی روایات کے خلاف کام تھا) تو حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے خاندان کی رنجش دور کرنا ضروری امر تھا اور یہ وہ پوشیدہ چیز تھی جو اللہ نے ظاہر کر دی۔ اس کی صورت اللہ تعالیٰ نے یہ نکالدی جو درحقیقت ایک عظیم کارنامہ تھا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو اپنی ازواج مطہرات سے گردانیں۔ بصورت دیگر اگر بفرض محال حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے حضور محبت رکھتے تو زید حارثہ کے نکاح میں لانے سے پہلے بھی اپنے عقد نکاح میں لاسکتے تھے اور کسی روک ٹھوک کا احتمال تک نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن آقائے نامدار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں نہیں کیا تو ثابت ہوا کہ اس نکاح کا محرک صرف محبت نہیں تھا جو لوگ اس الزام تراشی کے مرتکب ہوئے ہیں وہ اصل واقعات سے بے خبر ہیں اور اپنے منہ میاں میٹھو بنے ہوئے ہیں اور ان کے حق میں "چھوٹا منہ بڑی بات" سجتا ہے،

تیسرے اشکال کا جواب یہ ہے۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں سے اس لحاظ سے ایک گونہ اندیشہ تھا کہ خدانخواستہ کہیں یہ نکاح کا کارنامہ دین سے لوگوں کی نفرت کا موجب نہ بنے۔ اسی قسم کا اندیشہ ہر ایک رہنما کو ہوا کرتا ہے اور ہونا چاہیئے۔ لہذا یہ بھی مواخذہ کی

بات نہیں ہے۔ نکاح زینب رضی اللہ عنہا کے سلسلے میں مستشرقین کے یہ تینوں چہ میگوئیاں صرف دریدہ دہنی ہیں اور بس۔ مشہور ہے کہ معترض کا نا ہوتا ہے۔ معترض کو اصلاحی پہلو نظر نہیں آیا اور وہ ایک رسم بد کو ختم کرنا تھا۔ یہ رسم بد دو طریقوں سے مٹائی جا سکتی تھی۔ (۱) قولی (۲) فعلی۔ چونکہ متبنیٰ کی مطلقہ سے نکاح کرنا عرب کے قدیم روایات سے بُرا سمجھا جاتا چلا آرہا تھا اس وجہ سے ممکن تھا کہ صرف قول سے یہ رسم بد ختم نہ ہو جاتا لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق فعلی طریقہ کو اختیار فرمایا اور کارگر ثابت ہوا۔ نہ کسی کو توہم کا موقعہ ملا اور نہ کوئی صحابی یہ توہم کر سکتا تھا اور آج تک کسی مسلمان سے اس قسم توہم کا اندیشہ نہیں اور نہ قیامت تک ہو سکتا ہے۔ رہے مستشرقین حضرات تو ان کا کام شک و شبہات ڈالنا ہی ہے تو ان سے کیا شکایت ہو سکتی ہے۔

عصمت خاتم الانبیاء پر تیسرا اشکال اور اس کا جواب

"یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِکَ" اس اشکال کے دو پہلو ہیں (۱) تحریم الحلال (۲) رضائے الٰہی کے مقابلے میں مرضائے ازواج کو مقدم رکھنا۔ یہ دونوں کام شان پیغمبری کے خلاف ہیں حالانکہ قرآن مجید نے دونوں کو بصراحت بیان فرمایا ہے۔

اشکال کے پہلے پہلو کا جواب اس آیت کی شان نزول پر موقوف ہے۔ لہٰذا شان نزول کو مختصراً بیان کیا جاتا ہے۔ بخاری شریف میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عصر کے بعد حضرت زینب رضی اللہ عنہا بنت جحش کے گھر تشریف لے جایا کرتے تھے۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا جانتی تھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو میٹھا چیز

پسند ہے تو وہ آنحضرت ؐ کو شہد کا شربت پلایا کرتی تھیں اور یہ معاملہ روز دن تک گیا اس معاملہ پر حضرت عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما کو غیرت آئی اور آپس میں یہ سمجھوتہ کیا کہ ہم میں سے جس کے ہاں حضور ؐ تشریف لائے تو ان سے یہ کہہ بیاد د اِنِّی اَجِدُ مِنْکَ رِیحَ الْمَغَافِیر" مغافیر، ببول کی قسم سے ایک درخت عُرفُت کا گوند ہے جس کی بو کسی قدر ناگوار ہے۔

یہ حضرات مزاج شناس تھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خوشبو سے محبت اور بد بو سے نفرت ہے، منصوبہ کے مطابق ہر ایک نے جب حضور ؐ ان کے گھر تشریف لے گئے ان سے کہا، انی اجد منك، آہ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً فرمایا، انی شربت العسل عند زینب" اس کے بدل میں انہوں نے عرض کیا، جلست نحلہا العرفت، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، لا اَعودُ۔

فقہی قانون کے رو سے جائز الاستعمال چیز کو اپنے آپ پر بند کرنا یمین وقسم ہے اس بند کردہ شدہ چیز کے استعمال کے بعد کفارہ یمین دینا پڑتا ہے جو تحریر رقبہ یا سہ روزہ صوم یا طعام عشرۃ مساکین ہے۔ اس آیت میں تحریم حلال سے مراد تحریم لغوی ہے تحریم شرعی نہیں حتیٰ کہ اعتراض لازم آئے۔ معترض آیت کا مطلب غلط سمجھ رکھا ہے، صحیح ترجمہ یوں ہوگا۔ اے نبی تو اپنے اوپر وہ چیز کیوں بند کرتا ہے جس کا استعمال تجھ پر اللہ تعالیٰ نے آزاد کر دیا ہے اور اس سے ازواج کی خوشنودی چاہتا ہے۔ حضور ؐ نے شہد کو حلال سمجھتے ہوئے اسے اپنے آپ پر بند کر دیا تھا۔ علامہ الوسی نے روح المعانی میں لکھا ہے، والمراد من التحریم الامتناع، خود قرآن مجید میں یہ مادہ بندش کے معنی میں آیا ہے، فرماتا ہے، وحرام علی قریۃ اھلکناھا انھم لا یرجعون ط۔ اس حرام کا معنی یہ نہیں کہ تباہ شدہ بستی کا لوٹنا شرعاً حرام ہے بلکہ معنے یہ ہے کہ اس کا لوٹنا بند ہے۔ چونکہ جائز الاستعمال چیز کا استعمال بند

کرنا یمین ہے اس لئے اللہ تعالےٰ نے فرمایا، قد فرض اللہ تحلۃ ایمانکم۔

ازالۃ الاشکال ۔ اگر اس تحریم سے مراد تحریم شرعی نہیں جو ایک گناہ ہے تو بعد میں 'غفور رحیم' کا ذکر جو دال برارتکاب گناہ ہے مربوط نہیں ہوتا۔

اس اشکال کے دو جواب ہیں (۱) یہ ضروری نہیں کہ غفور رحیم کا ذکر مسبوق بالمعصیۃ ہوتا ہے بسا اوقات عدم الاثم اور 'غفور رحیم' جمع ہو جاتے ہیں جیسے کہ فمن اضطر غیر باغٍ ولا عادٍ فلا اثم علیہ ، اور آگے ارشاد ہوتا ہے ان اللہ غفور رحیم ہ یہاں نفی اثم اور مغفرت دونوں جمع ہیں (۲) مانا کہ غفور رحیم، سبق معصیت کا خواہاں ہے لیکن یہ نہیں مانتے کہ ہر معصیت معصیت شرعی ہو جو خلاف امر یا خلاف نہی کا ارتکاب ہے ۔ ابن حزم نے لکھا ہے کہ ایک کام گو گناہ شرعی تو نہ ہو لیکن منشا ایزدی کے خلاف ہو تو وہ کام بہ نسبت نبی کے ذم شمار کیا جاتا ہے اور یہ علو مرتبت کی نشانی ہے موجب اعتراض نہیں ۔ مذکورہ واقعہ میں بھی اللہ تعالےٰ کے منشا کے خلاف ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ پر تنگی لائی جبکہ اللہ تعالےٰ اس تنگی کو نہیں چاہتے تھے ۔

اشکال کے دوسرے پہلو کا جواب ۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ۔

عین الرضا عن کل عیب کلیلۃ ؛ وعین العداوۃ تکل عیب تنظرہا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نسبت یہ کہنا کہ انہوں نے مرضائے خداوندی کے مقابلے میں مرضائے ازواج کو مقدم رکھا صریح بہتان ہے ۔

اور اس پر تبتغی مرضات ازواجک کی دلیل پیش کرنا اپنی ہیچ مدانی کو طشت از بام کرنا ہے ۔

آں کس کہ نداند و نداند کہ نداند ؛ در جہل مرکب ابد الدہر بماند ،

حضور رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جائز خواہشات کے مقابلے میں ازواج مطہرات

کے خواہشات کو مقدم رکھا اور یہ کمال ہے۔ بخاری شریف میں ہے کہ کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یحب الحلو والعسل، اس کے باوجود کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شرینی اور شہد کو پسند کرتے تھے جب محسوس کیا کہ عائشہ رضؓ اور حفصہ رضؓ کو اس سے تکلیف پہنچتی ہے اور ممکن ہے کہ دیگر ازواج مطہرات کو بھی تکلیف ہو۔ حضورؐ نے شہد نوشی ترک کر دی۔ یہاں کا کمال تھا کہ ترک شرینی جو حقوق ازدواجی میں داخل نہیں تھا صرف اس لئے کیا کہ اس سے ازواج کو ایک قسم آرام پہنچتا ہوگا جبکہ استعمال شرینی حضورؐ کو پسند تھا۔ تو یہاں مقابلہ درمیان مرضائے الٰہی اور مرضائے ازواج نہیں بلکہ درمیان مرضائے حضورؐ اور مرضائے ازواج ہے

ے ببین تفاوت راہ از کجاست تا بکجا،

ے کمال صدق و محبت ببیں نہ نقص و گناہ ،، کہ ہر کہ بے ہنر افتد نظر بہ عیب کند ،،

ازالۃ الاشکال۔ حضرت عائشہ رضؓ اور حضرت حفصہ رضؓ نے ایک منصوبے کو کیوں باندھا جس کی تکمیل مندرجہ ذیل چند امور پر منتج ہوئی جو سیرۃ ازواج مطہرات کو نہیں سجتے۔

(۱) کذب انی اجد منک ریح مغافیر (۲) حسد بر زینب رضؓ (۳) حضورؐ کو ایک محبوب چیز کے ترک کرنے پر مجبور کرنا جو ایذائے نبی ہے اور یہ بڑا گناہ ہے (۴) قرآن کے ڈھانٹ کا مستحق ہونا۔ نقد صغت قلوبکما۔ جواب یہ ہے کہ اس منصوبے کے پس پشت حب رسول کارفرما تھا۔ تکمیل ایمان کے لئے حب رسول شرط اوّل ہے۔ یہ منصوبہ مندرجہ بالا امور میں سے کسی ایک پر بھی منتج نہیں ہوا۔ بایں طور کہ انی اجد منک الخ واقعات پر مبنی ہے عرب میں شہد کی مکھیاں عُرفت کے پھولوں پر بیٹھتی ہیں اور ان کا ناگوار بو شہد میں نمایاں ہوتا ہے جیسا کہ پہاڑی بکریوں کے چھاچھ اور گھی میں مختلف گھاس کی بو محسوس ہوتی ہے۔ اور یہ کارنامہ زینب رضؓ پر حسد کی بنا پر نہیں ہوا بلکہ بنا پر غبطہ ہوا ہے اور یہ فطری امر ہے

سوکن کے حق میں دوسری سوکن پر غبطہ کرنا غیر اختیاری ہے اور فطری اور غیر اختیاری امور پر مؤاخذہ نہیں ہے، فقد صغت قلوبکما، قرآن کا ڈھانٹ نہیں بلکہ تدبیر منزل کے زریں اصول سے ایک اصل ہے۔ ورنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کو کما کے ضمیر کا مصداق بتاتے ہوئے کیوں بے دھڑک فرماتے، تلك عائشۃ رض وحفصۃ رض۔ صغت کا معنی میلان کا ہے یعنی ان دونوں کے دل اس پر مائل ہوئے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت زینب رض سے زیادہ اپنی طرف مائل کریں اور یہ ہر ایک محب رسول کی خواہش ہوتی ہے۔ اس معاملہ سے حضور ص کو، کوئی تکلیف نہیں پہنچی ورنہ حضور ص اشارۃً ہی سہی حضرت عائشہ رض اور حضرت حفصہ رض کی توبیخ فرماتے لیکن ایسا نہیں کیا۔ چوتھا اشکال اور اس کا جواب۔

انا فتحنا لك فتحاً مبيناً ليغفر لك الله ما تقدم من ذنبك وما تأخر ٥ اس آیت کے پیش نظر اشکال کی تقریر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ سے خطاب کرتے ذنوب مقدم و مؤخر کی مغفرت فرمائی۔ ذنوب کے بغیر مغفرت معنی ندارد ہے اور ذنوب عصمت پیغمبر کے خلاف ہے۔ اس اشکال کے کئی جوابات ہیں جو ائمہ مفسرین نے بیان کئے ہیں۔

(۱) یہاں مجاز بالحذف ہے۔ ای ما تقدم من ذنبِ اُمّتك، امت کی مغفرت قبل العذاب اور بعد العذاب دونوں طریقوں سے ہو سکتی ہے۔ امت کے گناہ کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہونے کے متعلق بدرالدین زرکشی نے برہان میں یوں وضاحت کی ہے کہ چونکہ حضور ص کے ساتھ امت کا شدید تعلق ہے۔ اس مغفرت گناہ کا خطاب انہیں سے ہوا جیسے کہ یہ آیت ہوئی یٰایھا النبیّ اذا طلّقتم النّساء فطلّقوھنّ، آہ، یہاں خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے مگر مراد امت ہے اس قسم کی کئی ایک مثال قرآن مجید میں موجود ہیں۔

(۲) جیساکہ خطاب حضورؐ سے ہے ایسا ہی مراد بھی حضور ہیں لیکن ذنب سے مراد گناہ شرعی جو خلاف امر و نہی کا ارتکاب ہے نہیں ہے بلکہ یہاں ذنب سے مراد خلاف اولیٰ ہے۔ ابن حزم نے ملل نحل میں صراحت کی ہے کہ چونکہ پیغمبر کی شان بلند ہوتی ہے اس وجہ سے معمولی کام بھی جو ان کے شایان شان نہ ہو گناہ سمجھا جاتا ہے۔ اور یہ جلالت شان کی نشانی ہے۔

(۳) ابن حزم نے لکھا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی طرف ذنوب منسوبہ کی حقیقت افعال مباحہ ہوتی ہے جو معصیت شرعی کی حدود سے باہر ہے لیکن چونکہ کبھی کبھار وہ افعال مباحہ منشاء ایزدی کے خلاف واقع ہوتے ہیں اسلئے اُن سے ذنب کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے یا اس پر ایسا نتیجہ مرتب ہوتا ہے جو ایک گناہ پر مرتب ہو۔ اس کی مثال جنگ بدر کے قیدیوں کے فدیہ کا واقعہ ہے کہ حضورؐ نے اپنا اجتہاد صدیق اکبرؓ کے اجتہاد کے ساتھ ملاکر فدیہ لینے کا فیصلہ کیا چونکہ یہ فیصلہ نص کے خلاف تو نہیں تھا کیونکہ پہلے نص وارد تھا ہی نہیں لیکن اللہ تعالےٰ کے منشائے کے خلاف تھا لہذا اللہ تعالیٰ نے ما کان للنبی، آہ. کی آیت نازل کرکے ڈھانٹ پلائی، حضور علیہ الصلوۃ والسلام جان کر روئے اور فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ کوئی عذاب نازل فرماتا تو عمرؓ کے سوا اور کوئی نہ بچتا۔
یہ فیصلہ شریعت کے روسے غلط نہیں تھا کیونکہ اس قسم واقعہ کے متعلق کوئی قانون وارد ہوا نہیں تھا ورنہ اللہ تعالیٰ توڑ دیتا لیکن نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ خلاف شریعت فیصلہ نہیں ہوا تھا پھر بھی حضورؐ روئے اور افسوس کا اظہار فرمایا جیساکہ ایک گناہ پر ہوتا ہے۔

(۴) یہ جواب تحقیق کے قریب ہے، لیغفرلک، آہ، میں غفر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، غفر عربی میں حائل اور ساتر کو کہا جاتا ہے۔ جب غفر بمعنی ساتر ہے تو اس معنی کے اعتبار سے مغفر اس سے لیا گیا ہے جس کا معنی خول ہے اور شک نہیں کہ خول سر کو تیر و تلوار کے لگنے سے محفوظ رکھتا ہے۔
جب غفر کے اصلی معنی حائل ہے تو مغفرت کی حقیقت انبیاء اور غیر انبیاء کے نسبت مختلف ہے۔

بایں طور کہ جب مغفرت غیر انبیا کی طرف منسوب ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت گناہ اور سزائے گناہ کے درمیان حائل ہے یعنی اگر خدا کی رحمت بیچ میں نہ آتی تو گناہ پر اس کے نتائج مرتب ہو جاتے اور جب مغفرت انبیاء کی طرف منسوب ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ رحمت خداوندی پیغمبر اور گناہ کے درمیان حائل ہو جاتی ہے، تو آیت کا مطلب یوں ہوگا، لیغفر لک اللہ ا ہ ای لیظھر ان رحمتہ وقعت حائلاً بینک وبین الذنب فیما تقدم و تقع ساتراً بینک وبین الذنب فیما تأخر، ۔ واللہ اعلم ۔

گذرے ہوئے جوابات اپنی اپنی جگہ پر صحیح اور درست ہیں لیکن یہ سیاق وسباق آیت سے جوڑ نہیں کھاتے . بایں طور کہ انا فتحنا، پر تین چیزیں مرتب ہیں ۔ (۱) مغفرت (۲) اتمام نعمت (۳) منصوریت ۔ تو یہ تینوں چیزیں جیسے کہ فتح معہودہ کے بعد آسکتی ہیں فتح سے پہلے بھی ہو سکتی ہیں حالانکہ کوئی بھی کام مسبوق بالنتیجہ نہیں ہو سکتا ۔ لہذا مثلاً مغفرت کی کوئی ایسی توجیہہ ہونی چاہیئے جس کی بنا پر یہ فتح معہود پر مرتب ہو اور اس کا تحقق فتح سے پہلے محال ہو ۔ اس توجیہہ کے لئے صورتحال کا جائزہ لینا ضروری ہے ۔ حضور علیہ السلام کی بعثت کی مقصد کا تعین قرآن مجید نے چند ایک آیات میں کر دیا ہے ۔ ان آیات میں سے ایک یہ ہے ۔ ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ، آہ ،،

،ترجمہ،، اللہ وہ ذات ستودہ صفات ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیج دیا ہے تاکہ وہ اسے دیگر ادیان پر غلبہ دیں ۔ ہدایت سے مراد احکام فقہی اور دین سے مراد عقائد حقہ ہے ۔ اس آیت کے مضمون کو دیکھ کر صاف ثابت ہوا کہ مقصد رسالت دین اسلام کو کل ادیان پر غالب کرنا ہے حالانکہ یہ مقصد آغاز رسالت سے لیکر فتح مکہ تک جو انیس برس کا عرصہ ہے اور زمانہ رسالت کا بڑا حصہ ہے کما حقہ پورا نہ ہو سکا کیونکہ اس وقت تک مرکز عرب

دشمنان اسلام کے ہاتھ میں تھا۔ اب قدرتی بات ہے کہ جب ایک پیغمبر کی رسالت کسی خاص مقصد کے لئے ہو اور وہ مقصد زمانہ رسالت کی طویل ترین مدت میں پورا نہ ہونے پائے تو دل میں یہ کھٹکا آتا ہے کہ کہیں مجھ سے تبلیغ میں قصور تو نہیں آیا؟ خواہ اس مقصد کے پورا نہ ہونے کے اسباب وعلل کچھ اور کیوں نہ ہوں لیکن عبد کامل اس کے وجوہات اپنی کوتاہی سمجھ لیتا ہے، انیس ۱۹ سال گذرنے کے بعد ہر قسم سر توڑ کوشش کے باوجود جب خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوئے تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کی وجہ اپنی کوتاہی ٹھہرائی اور اس موہومہ کوتاہی سے اللہ تعالیٰ نے لفظ ذنب کے ساتھ تعبیر فرمایا جب مکہ فتح ہوا اور لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے جیسا کہ، اذا جاء نصر اللہ والفتح آہ، سے واضح ہے تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مشاہدہ فرمایا کہ مقصد رسالت پورا ہوا اور نتائج مطلوبہ مرتب ہوئے اور تبلیغ میں کوتاہی آئی نہیں اور یہی نتائج اس کوتاہی موہومہ کی مغفرت تھی۔ واضح ہوا کہ فتح مکہ سے پہلے اس ذنب کی مغفرت ممکن نہیں تھی اور یہی مغفرت فتح مکہ پر ہی مرتب ہو سکتی تھی، لاغیر"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے زمانے تک دس ۱۰۰۰۰۰۰ لاکھ مربع میل زمین اسلام کے جھنڈے کے تلے آچکی تھی جو تقریباً تین پاکستان کے رقبے کے لگ بھگ ہے،

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جو دس سالہ خلافت عمرؓ کا زمانہ ہے بائیس لاکھ پینسٹھ ہزار مربع میل زمین عالم اسلام میں داخل ہو گئی تھی جو تقریباً دس پاکستان کے برابر ہے۔

نوٹس لکھتے وقت موجودہ بنگلہ دیش پاکستان کا ایک حصہ تھا

پانچواں اشکال اور اس کا جواب

عبس وتولیٰ ان جاءہ الاعمیٰ ... اس سورت کے بیت پر اشکال ہے اور اس کے جواب کی وضاحت کے لئے اس سورت کے شان نزول پر نظر رکھنا ضروری ہے ... اس کا بیان ضروری ہے۔ واقعہ یوں تھا کہ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں وہ سردار قریش ...

ہو گئے تھے اور آنحضرت صؐ ان سے تبلیغ دین میں معروف تھے کہ عبد اللہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ جو نابینا تھے وارد ہوئے اور ایک فقہی مسئلہ کے متعلق، عَلِّمنی کما علّمک اللہ یارسول اللہ، ابتدا کی۔ وقت کی نزاکت کے رو سے آنحضرت صؐ نے ناگواری کا اظہار فرمایا اور سائل سے رُخ پھیر لیا۔ اللہ تعالیٰ کو یہ ادا پسند نہ آئی اور عبس وتولیٰ ان جاءہُ الاعمیٰ آہ، کو نازل فرمایا۔ تو اشکال یہ پڑا کہ عبد اللہ ابن ام مکتوم سے آنحضرت کا منہ موڑنا معصیت تھا یا نہیں، اگر نہیں تو عتاب کیوں؟ اگر معصیت ہے تو یہ شان نبوت کے خلاف ہے۔

جواب یہ ہے کہ عبد اللہ ابن ام مکتوم رضؓ سے آنحضرت صؐ کی بے اعتنائی ایک حکمت کی وجہ سے تھی اس سے مقصود تحقیر سائل ہرگز نہیں تھا۔ حکمت یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم منصب رسالت کو ملحوظ رکھتے ہوئے تہ دل سے یہ چاہتے تھے کہ رؤسائے قریش جیسے بھی بن پڑے زیادہ سے زیادہ اسلام کے حلقہ بگوش ہو جائے اور اس وقت ان سے توجہ ہٹانا اس مقصد کے حاصل ہونے میں حائل ہو سکتا تھا۔ سائل چونکہ پہلے سے نور ایمان سے منوّر ہو چکے تھے اور ان کے دل سے یہ روشنی نکلنے والی نہیں تھی، اس کے سوال کا جواب کسی دوسرے وقت میں حل کر دینا اس کے حق میں کمی نہ تھی اس کے علاوہ مسائل کا سوال فقہی اور فرعی تھا جبکہ حضور اصول دین سمجھانے میں مشغول تھے۔ [illegible] دین کو اصول دین سے روشناس کرنا بہ نسبت ایک سچے مسلمان کے فرعی سوال کے جواب سے زیادہ [illegible] مقدم ہے [illegible] القلب کے [illegible] نزلہ زکام کے مریض کے علاج سے اولیٰ اور مقدم [illegible] طبیب کی شفقت کے خلاف ہے۔ کیونکہ [illegible] جان لیوا مرض ہے جبکہ نزلہ و زکام چند روزہ اور خفیف۔ [illegible] قانون کو سامنے رکھ کر حضور صؐ نے وہ کیا جو کیا اور [illegible] اس قسم کام کو قابل اعتراض نہیں جانتا چہ جائیکہ معصیت ہو۔

ھ عبد اللہ بن شریح بن مالک بن ربیعہ الفہری من بنی عامر بن لوئی۔ وام مکتوم ام ابیہ، (کشاف)

رہا یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر عتاب آیا اور خود آنحضرت کو اس عتاب کا، احساس تھا کہ جب کبھی عبد اللہ ابن ام مکتوم رضی حضورؐ کے پاس جاتے تو آپؐ فرماتے تھے مرحبًا بالذی عاتبنی اللہ بہٖ۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ عتاب آیا ہے لیکن یہ عتاب مسبوق بالمعصیۃ نہیں ہوتا، اللہ کا یہ عتاب برمحل نازل ہوا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو دل سے چاہتے تھے کہ رؤساء قریش حق کے تابع ہو جائیں اور اس کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر ایک معقول دلیل پیش فرماتے تھے مگر رؤساء قریش اپنی بری خصلت کی وجہ سے بجائے اس کے کہ بات مانتے، دلیل کو معقول سمجھتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کو جنونی جانتے تھے (العیاذ باللہ) اور وہ خوش قسمت نابینا آنحضرت کا ارشاد جان سے عزیز سمجھتے تھے تو رؤساء قریش پر نظر مرکوز رکھنا اور ابن ام مکتوم رضی سے گو وقتی ہی سہی منہ موڑ لینا ایسا ہے کہ ایک مزمن مریض طبیب کے علاج کا مذاق اڑاتا ہے اور ایک معمولی مریض طبیب کے علاج کو نوشتہ تقدیر سمجھتا ہے مگر وہ طبیب پہلے مریض کے علاج کے درپے ہوتا ہے اور دوسرے مریض سے منہ موڑ لیتا ہے، واضح ہے کہ اس ادا پر گو حکمت پر مبنی تھا تنبیہ دینا مناسب تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس ادا کو یوں پیش کیا ہے، قرآن مجید فرماتا ہے۔

امّا من استغنیٰ فانت لہٗ تصدّیٰ وما علیک الّا یزکّیٰ وامّا من جاءک یسعیٰ وھو یخشیٰ فانت عنہ تلھّیٰ،

شمشیر نیک ز آہن بد چوں کند کسی ، ناکس بہ تربیت نشود اے حکیم کس،

باران کہ در لطافت طبعش خلاف نیست ، در باغ لالہ روید و در شورہ بوم و خس،

صحبت علیہ ابنائے خر کو انسان کس طرح،

تربیت سے واقعی نا اہل دانا کب بنے،

ھ و یقول ھل لک من حاجۃ (کشاف)

ازالۃ الاشکال ۱: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا مقام تو بہت بلند ہے اور ان میں سے کوئی بھی جرأت نہیں کرسکتا تھا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مجلس میں جاکر نازیبا حرکت کا ارتکاب کرلیتا۔ مگر عبداللہ ابن ام مکتوم رضؓ ایسے کر بیٹھے کہ وہاں جاکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دوران تبلیغ دخل انداز ہوئے اور ایسا کرنا صحابی کے شایان شان نہیں۔

۲۔ سورۂ عبس عبداللہ ابن مکتومؓ کی مدح میں نازل ہوئی ہے اور مقام مدح میں عیوب کا ذکر زیبا معلوم نہیں ہوتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ عبداللہ ابن ام مکتومؓ کو ان جائے الاعمیٰ، سے ظاہر کردیا گیا؟

جواب عن الاشکالین۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شمائل شریفہ میں سے ایک یہ تھا کہ جب بولتے تو ٹھہر ٹھہر کر بولتے یہاں تک کہ اگر کوئی آنحضرتؐ کے الفاظ شمار کرنا چاہتا تو شمار کرسکتا۔ حدیث میں آتا ہے "لو عدھا العادُّ لعدّھا"۔ جب عبداللہ ابن ام مکتوم مجلس میں وارد ہوئے تو آپؐ اپنی عادت شریفہ کے رو سے سکتہ کر رہے تھے اور عبداللہ ابن ام مکتومؓ نے جبکہ نابینا تھے یہ سمجھا کہ حضورؐ فارغ بیٹھے ہوئے ہیں اور کسی سے مصروف گفتگو نہیں۔ لہٰذا انہوں نے جو کچھ کہنے والے تھے کہا۔ اس صورتحال کے پیش نظر عبداللہ ابن ام مکتومؓ کی شان پر حرف نہیں آتا۔

اشکال دوم کا جواب

رہا یہ کہ عبداللہ ابن ام مکتومؓ کو اعمیٰ کے لفظ سے یاد کیا گیا حالانکہ مقام، مقام مدح ہے اور عمیٰ ایک عیب ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بھی مدح کے لئے ذکر ہوا ہے بایں طور کہ سائل کے دل کی آنکھیں روشن ہیں اس لئے دین کے ایک مسئلہ کی تحقیق چاہتا ہے۔ مگر رؤسائے قریش عقل کے اندھے ہیں کہ ایک موٹا مسئلہ جو مسئلۂ توحید باری ہے نہیں سمجھ سکتے کیا ہوا کہ ان کے چہروں پر آنکھوں نامی دو سوراخ ہیں جو گاؤ خر بھی یہ رکھتے ہیں۔ نیز اس سے معذرت سائل اور مزید

استعطاف کا مستحق ہونا واضح ہوجاتا ہے اور یہ مدح ہے۔

ازالۃ الاشکال۔ سورۂ عبس میں اللہ تعالیٰ متکلم اور حضور علیہ السلام مخاطب ہیں لیکن طرز تکلم بصیغۂ غائب ہے یہ کیوں؟ یوں چاہیئے تھا، عَبَسْتَ وَتَوَلَّیْتَ آہ، جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عتاب کی شکل میں تنبیہ دیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احترام کا پاس رکھنا بھی چاہتے تھے اس لئے روبرو عتاب کرنا کہ عبستَ و تولَّیتَ، نہیں فرمایا کیونکہ یہ نہج عربی میں درشت لہجہ ہے اور غیبوبتہ کا لہجہ خفیف ہے اس لئے احف اللہجتین سے تعبیر کیا گیا اور یہ قرآن مجید کا کمال ہے کہ اس کا ہرایک کلام مقتضیٰ الحال کے مطابق ہوتا ہے۔

ازالۃ الاشکال۔ وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰی اَوْ یَذَّکَّرُ فَتَنْفَعَہُ الذِّکْرٰی، میں تزکیہ اور تذکر کو اَوْ کے تحت بیان کیا گیا ہے ان کے درمیان فرق کیا ہے؟

جواب یہ ہے کہ جہل جو روح وقلب کے لئے کدورت ہے علم سے زائل ہوجاتا ہے اور یہ علم تزکیہ ہے۔ علم کے بعد تذکر اور تذکر کے بعد عمل ہوتا ہے اور یہ عمل عالم کے لئے نفع مند چیز ہے اس لئے بالترتیب علم، تذکر اور عمل لائے گئے اور علم و تذکر کے درمیان فرق واضح ہے۔

ازالۃ الاشکال۔ جب عمل کے لئے علم اور حفظ علم دونوں ضروری ہیں تو اَوْ کے تحت لانا درست نہیں کیونکہ اَوْ تردید کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

جواب یہ ہے کہ یہاں اَوْ مانعۃ الخلو کیلئے آیا ہے لہٰذا جمع بین علم و تذکر جائز ہے۔

ازالۃ الاشکال۔ جب جمع جائز ہے تو اس کے لئے صریح حرف واؤ لانا چاہیئے تھا۔

جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ احد الامرین کی صورت میں جو علم یا تذکر علم ہے کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو توجہ کرنے کی ضرورت بتلاتا ہے اور یہ اَوْ کا مفاد ہے چہ جائیکہ جب دونوں مجتمع ہوں، بخلاف

واؤ کے کہ اگر واؤ لایا جاتا تو معنی یوں ہوتا کہ جب سائل میں علم اور تذکر علم دونوں مجتمع ہوں تو توجہ کرنا چاہیئے اور واحد الامرین کی صورت میں توجہ ضروری نہیں ہے۔ حالانکہ سورۃ سورۃ دال ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے توجہ فرمانے کے لیئے علم اور تذکر علم میں سے ایک بھی کافی تھا عبداللہ ابن ام مکتوم رض طلب علم کے لئے آئے اور چونکہ نابینا تھے تو حافظہ بھی قوی رکھتے تھے تو یہ حضور ص کی توجہ کے زیادہ حقدار تھے۔

ازالۃ الاشکال۔ شروع سورۃ میں صیغہ غائب کا استعمال ہوا ہے اور بعد صیغہ خطاب استعمال ہوئے اس کی کیا وجہ ہے اور اس انتقال میں نکتہ کیا ہے؟

جواب۔ یہ ہے کہ یہاں عتاب اور مقام رسالت کا اجتماع ہے عتاب گرمی اور تیزی کا خواہاں ہے لیکن مقام رسالت نرمی اور احترام کا طلبگار۔ تو شروع میں مقام رسالت کا پاس رکھا گیا ہے اور بعد میں عتاب کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور عکس نہیں ہوا تاکہ معلوم ہوجائے عتاب پر اللہ تعالیٰ کے ہاں مقام رسالت زیادہ وزنی ہے۔

؎ خدا مدح آفرین مصطفیٰ بس!

چھٹا اشکال اور اس کا جواب

مستشرقین واقعہ بدر پر اعتراض کرتے ہیں کہ اس کا مقصد اس قافلے پر ڈاکہ ڈالنا تھا جو شام سے مکہ جاتے ہوئے مدینہ سے گذر رہا تھا۔ کسی قافلے پر ڈاکہ ڈالنا شان پیغمبری کے خلاف ہے۔ اس اعتراض سے مرعوب ہوکر سیرۃ نویسوں نے مختلف راہیں اختیار کئے ہیں۔

علامہ شبلی رح نے انکار کیا ہے کہ صحابہ کرام ڈاکہ ڈالنے کی غرض سے مدینہ منورہ سے نکلے تھے اور اس پر دلائل پیش کئے ہیں۔

مولانا ادریس کاندھلوی شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور نے سیرۃ المصطفےٰ میں صاف لکھدیا ہے کہ صحابہ رض کو ڈاکہ ڈالنا مقصود تھا۔ ان دونوں باتوں میں تکلفات ہیں اصل واقعات پر نظر ڈالنے کے بعد مستشرقین کے اعتراض کا صحیح جواب مل جاتا ہے۔

مواہب لدنیہ، سیرۃ ابن ہشام، عیون الاثر، طبقات ابن سعد میں مذکور ہے کہ کفار مکہ مدینہ پر ایک وقت حملہ کرنا چاہتے تھے اس حملے کی تیاری کے اخراجات کے لئے یہ تجویز پاس کی کہ شام سے تجارت کرنے کی جملہ آمدنی اس حملہ پر صرف کیا جائے۔ اس تجارت کے سرمایہ کے لئے مرد و عورت نے امداد کی۔ اس قافلہ کا سامان پچاس ہزار پونڈ کا تھا۔ یہ قافلہ ابوسفیان کی قیادت میں شام روانہ ہوا اور وہاں پہنچ کر اپنا مال فروخت کیا اور وہاں مال خرید کر واپس ہوا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور صحابہ رض کو کفار کے منصوبہ کا پورا علم تھا۔ یہ بین الاقوامی اصول میں سے ہے کہ ہر ایک دشمن اپنے دشمن کے ہر ایک منصوبے کو ناکام بنانے کی تدبیر کرتا ہے اور اپنی حفاظت کے لئے معقول انتظام کا ہر ایک گوشہ ڈھونڈتا ہے۔

مسلمانوں کی مٹھی بھر جماعت کیسے گوارہ کر سکتی تھی کہ اس کا قوی دشمن اس پر حملہ کرنے کے لئے اس قافلے کی مالیت صرف کرنے والا ہے۔ یہ فطری خواہش ہے کہ یہ قافلہ مکہ نہ پہنچے اور اس کی مالیت مسلمانوں کے خلاف خرچ نہ ہونے پائے۔ مسلمانوں نے قافلے کا راستہ روکنا چاہا کیونکہ شام سے مکہ جانے کے لئے مدینہ منورہ راستے میں پڑتا ہے۔

جب ابوسفیان کو جو امیر قافلہ تھے اطلاع ہوئی تو مدینہ کا راستہ چھوڑ کر سمندر کے کنارے

کے راستے پر مکہ جا پہنچا اور ابوجہل کی لشکر جو قافلے کو بچانے کے لئے روانہ ہوئی تھی مقام بدر میں پڑاؤ ڈالا اور مسلمانوں سے ایک جنگ کی جس میں وہ خود اور کئی جنگ جو سرداران قریش ہلاک ہوئے۔ قافلے کا راستہ روکنا ڈاکہ ڈالنے کیلئے نہیں تھا اس لئے کہ ڈاکہ ڈالنے کا مقصد مال لینا ہوتا ہے خواہ وہ دشمن کا ہو یا غیر دشمن کا لیکن مسلمانوں کا مقصد صرف یہ تھا کہ ان کا دشمن جو ظاہری اسباب سے طاقتور ہے اور ہر وقت حملے کے درپے ہے اس قافلے کی دولت سے مزید طاقتور نہ بننے پائے۔ اور یہ مقصد بھی بعض مسلمانوں کا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر مسلمانوں کا مقصد یہ تھا کہ اس لشکر سے لڑنا چاہیئے جو ابوجہل کی قیادت میں مدینہ کے قریب پہنچ آئی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرنا عقل و دانش کے خلاف ہے لیکن مستشرقین کا منہ بند نہیں ہوتا وہ تو جہاد پر بھی اعتراض کرتے ہیں حالانکہ توراۃ میں جہاد کا ذکر موجود ہے اور وہ مسلمان بھی اعتراض سے پاک ہیں اور ان کی رائے صحیح تھی بھی اس لئے کہ اس قافلے کی دولت سے جنگ احد اور جنگ احزاب لڑی گئی ہیں، "قاتلوھم حتیٰ لا تکون فتنۃ ویکون الدین للہ"۔ ایک پاکیزہ مقصد ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کفار کی شوکت کو توڑنا ضروری ہے خواہ یہ قافلے پر حملہ کرنے سے حاصل ہوتا ہو یا جنگ کرنے سے۔ ؎

سرچشمہ باید گرفتن بہ میل ؛ چو پر شد نخواہد گذشتن نہ پیل ،

شوکت کفار آسمانی دین کے راستے میں ایک رکاوٹ ہے اس رکاوٹ کو ہر قیمت پر ہٹانا مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے۔

سورۃ انفال کی آیت ۷ "واذ یعدکم اللہ احدی الطائفتین" آہ، کی تفسیر میں مولانا فتح محمد خان جالندھری مرحوم فرماتے ہیں کہ اس جنگ (بدر) کی وجہ نہایت قرین قیاس ہے۔ یہ ہے کہ قریش مکہ کو مہاجرین اور انصار مدینہ کے ساتھ سخت عداوت تھی اور وہ ہمیشہ ان کے درپے

ازار رہتے تھے تو جناب رسالتمآبؐ اپنے دشمنوں کے حالات اور ارادوں سے آگاہ رہنے کے لئے کبھی کبھی اطراف مکہ میں آدمی روانہ فرماتے۔ چنانچہ ایک دفعہ مقام نخلہ میں جو مکہ اور طائف کے درمیان واقع ہے آپؐ نے چند آدمی روانہ فرمائے جن کے سردار آپؐ کے پھوپھی زاد بھائی عبداللہ بن جحش تھے۔ نخلہ ایک خطرناک مقام تھا اور وہاں جانے کا سخت اندیشہ تھا آپؐ نے احتیاطاً عبداللہ کو ایک سربمہر پرچہ دیا اور فرمایا کہ مکے کی طرف برابر چلے جاؤ تین روز کے بعد اس پرچے کو کھولکر پڑھنا اور جو اس میں لکھا ہے اس پر عمل کرنا۔ پرچے میں لکھا تھا کہ، اِمضِ حتیٰ تنزل نخلۃ فترصد بھا قریشاً و تعلم لنا من اخبارھم، یعنی نخلے تک چلے جاؤ اور وہاں پہنچ کر مخفی طور پر قریش کے حالات معلوم کرو اور ہمارے پاس ان کی خبر لاؤ۔ مگر وہاں اور ہی معاملہ پیش آیا کہ ان کے نخلے میں پہنچنے کے بعد قریش کا ایک چھوٹا سا قافلہ طائف کا مال تجارت لئے ہوئے آپہنچا۔ عبداللہ اور ان کے رفقا کو ارشاد نبوی اور اس پرچے کا خیال نہ رہا اور انہوں نے ان لوگوں پر حملہ کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عمرو بن عبداللہ حضرمی جو سرداران مکہ میں سے تھا تیر سے مارا گیا اور حکم بن کیسان اور عثمان بن عبداللہ مخزومی گرفتار ہو گئے۔ ہر چند رسول خدا نے ان لوگوں کو اس حرکت پر بہت ملامت کی اور قیدیوں کو چھوڑ بھی دیا۔ اور عبداللہ بن حضرمی کا خونبہا بھی اپنے پاس سے دے دیا، مگر اہل مکہ کی آتش کینہ بے مشتعل ہوئے نہ رہی اور انہوں نے ساڑھے نو سو کے قریب جنگ آزمودہ اشخاص جمع کئے جن میں سے تین سو کے پاس گھوڑے اور باقیوں کے پاس سواری اور باربرداری کے لئے سات سو اونٹ تھے۔ اس کے علاوہ کسی نے یہ ہوائی اڑائی کہ جناب رسول خدا ابوسفیان والے قافلے کو جو شام سے مکے کو آرہا ہے لوٹنے کا ارادہ رکھتے ہیں اس خبر سے ان کا غضب اور بھی بھڑک اٹھا اور وہ فوراً مدینے پر حملہ کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ ادھر مدینے میں یہ خبر پہنچ چکی تھی کہ قریش مکہ بہت زور و شور سے مدینے پر چڑھائی کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اس صورت میں ضرور تھا کہ جناب رسالتمآب اپنی حفاظت کا انتظام فرماتے

تو آپؐ نے تین سو تیرہ اشخاص کی جمعیت کے ساتھ مدینے سے کوچ فرمایا جن میں سے ایک یا دو کے پاس گھوڑے تھے اور باقیوں کے پاس صرف ستر اونٹ تھے جن پر نوبت بہ نوبت تین تین، چار چار آدمی سوار ہوتے تھے۔ چنانچہ خود جناب سرورِ کائنات اور حضرت علیؓ اور زید بن حارثہ ایک ہی اونٹ پر باری باری سے سوار ہوتے رہے۔ جب بمقام بدر پہنچے تو قریش سے لڑائی ہوئی جس میں ان کے ستر آدمی مارے گئے اور اتنے ہی گرفتار ہوئے اور بہت سامان و اسباب مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ مقتولین میں ابو جہل اور عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ اور ولید بن عتبہ اور حنظلہ ابن ابی سفیان۔ اور نوفل اور ابو البختری وغیرہ چوبیس آدمی سرداران قریش میں سے تھے جن میں سے ابن ہشام کی روایت کے مطابق نو کو حضرت علی مرتضیٰؓ نے تہ تیغ کیا تھا۔ مسلمانوں میں سے صرف چودہ آدمی شہید ہوئے جن میں چھ مہاجر اور آٹھ انصار تھے۔ قرآن کی آیتوں کو دیکھو پانچویں آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب سرورِ کائنات ابھی مدینے میں تھے اور کوچ نہیں فرمایا تھا کہ صحابہؓ میں اختلاف واقع ہوا بعض لڑائی کو پسند کرتے تھے اور بعض ناپسند کرتے تھے۔ چھٹی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان قریش مکہ کی اس فوج کثیر کے مقابلے سے ہچکچاتے تھے جو انہوں نے مدینے پر حملہ کرنے کی غرض سے جمع کی تھی ورنہ قافلے تجارت کو لوٹ لینے کے ارادے سے تکلیف کرنا کسی صورت میں موت کی طرف ہانکا جانا نہیں ہو سکتا۔ ساتویں آیت میں دو گروہوں کا ذکر ہے۔ ایک جو لڑائی کا ساز و سامان نہیں رکھتا اور وہ ابو سفیان کا قافلہ تجارت تھا جو شام سے آرہا تھا دوسرا گروہ قریش مکہ یعنی ابو جہل کا لشکر تھا۔ جس کی بہت سی جمعیت تھی اور جس کے ساتھ بہت سامان جنگ تھا۔ غرض بے ہتھیار لوگوں پر حملہ کرنا تو خدا کو منظور اور پسند نہ تھا۔ فوج مسلح کا مقابلہ کیا گیا تو اس کے وعدے کے مطابق مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔

(ختم شد بفضلہٖ و کرمہٖ)

۳۰، اگست ۱۹۶۹ء ۔ ۶، جمادی الاخریٰ ۱۳۸۹ھ